برگِ سبز
مُرتّبہ
سید منصور عاقل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکتبِ داغ کے نورتن اور قادر الکلام شاعر
سید عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی (۱۸۶۳ــــــ۱۹۴۳)
کا انتخابِ کلام سوانحی خاکوں اور نقد ونظر کے جائزوں کے ساتھ

مُرتبّہ
سید منصور عاقل

جملہ حقوق بحقِ مُرتّب محفوظ

موضوعِ کتاب	سید عبدالوحید فدا آگلاڈھوی کا انتخابِ کلام اور تجزیہ۔
مُرتّب	سید منصور عاقل
طباعت	جنوری ۱۹۹۲ء
مطبع	ورڈ میٹ اسلام آباد
تعداد	ایک ہزار
قیمت	

ناشر: مکتبہ اتحاد المصنفین ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۳۹
اسلام آباد (پاکستان)

(۱۸۹۱ء)

شکل کہتی ہے فداؔ سے متحیّر ہو کر۔ آپ کیا ہو گئے تصویر بدل جانے سے

○

والدہ مرحومہ سیدہ تلمیذ فاطمہ
کے نام جن کے فیضانِ تربیت نے
مجھے زیرِ نظر کتاب مرتّب کرنے
کی توفیق عطا فرمائی۔

——— منصور عاقل

مندرجات

"مرہم زخمِ جان و خاطرِ ریش
برگِ سبز است تحفۂ درویش"

سعدیؒ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پیش لفظ

حضرت داغؔ دہلوی اُردو کے ایک قادرالکلام شاعر ہی نہیں تھے، بے شمار اعلیٰ درجے کے شاعروں کے استاد بھی تھے۔ ان کے شاگرد ہندوستان میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ علامہ اقبالؒ ایسے عظیم شاعر نے بھی ان سے اصلاح لی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں شاعری کے ایک استاد کی حیثیت سے ان کا مرتبہ کیا تھا۔

داغؔ کے بے شمار باصلاحیت شاگردوں میں ایک شاعر حضرت فداؔ گلاؤٹھوی بھی تھے۔ فداؔ صاحب اپنے زمانے میں بہت مشہور رہے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں اُن کے دم سے بڑی رونق تھی اور اس عہد کی ادبی دُنیا میں ان کا بڑا احترام تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کے غزل گو شاعر تھے اور اس زمانے میں ان کی شاعری کی شہرت آسمان پر پہنچ چکی تھی۔ ان کے ہم عصر ان کی شاعری کے دلدادہ تھے اور عوام ان کی شاعری سے محظوظ ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے بیسویں صدی کی دوسری اور تیسویں دہائی کا ماحول دیکھا ہے وہ اس حقیقت کی تصدیق کریں گے کہ اس زمانے کے مشاعرے ان کے بغیر کچھ پھیکے پھیکے سے نظر آتے تھے۔

اردو کے بیشتر غزل گو شاعروں کی طرح ان کا کلام کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا اسی لئے آج انہیں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس زمانے کے مختلف رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا لیکن ان کی بے نیازی ان کے کلام کی ترتیب و اشاعت میں حائل رہی۔ شکر ہے کہ ان کا کلام دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہا۔ اور اب ان کے نواسے سید منصور عاقل صاحب نے اس کو تلاش کر کے کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی طرف توجہ کی جو میرے خیال میں ایک اہم ادبی خدمت ہے اس لئے کہ اس طرح ان لوگوں کو بھی اس قادر الکلام شاعر کی شاعری سے آشنا ہونے کا موقع ملے گا جس کا خوبصورت اور دلنشین کلام ابھی تک ان کی دسترس میں نہیں تھا۔

میری ناچیز رائے میں ایسے تمام اردو شاعروں کا کلام جدید انداز میں شائع ہونا چاہیئے جو ان کے زمانے میں طباعت و اشاعت کی دشواریوں کے باعث شائع نہ ہو سکا کیونکہ ان شاعروں میں ایسے ایسے گوہر نایاب تھے جن کی شعری کاوشوں نے اردو شاعری کی روایت میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو منصور عاقل صاحب کا یہ کام نہایت گراں قدر ہے، اور اردو کی شعری روایت میں بیش بہا اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ فدؔا صاحب کے اس کلام کو شوق سے پڑھیں گے کیونکہ اس میں ان کے لیے محظوظ ہونے اور مسرت حاصل کرنے کا خاصا سامان ہے۔

منصور عاقل صاحب نے فدا صاحب کی شخصیت اور شاعری پر جو گراں قدر مقالہ لکھا ہے اس سے مجھے بھی فدا صاحب کی شاعری سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ ان کے کلام میں بڑی پختگی ہے، اور اس کو پڑھ کر اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے روزمرہ اور محاورہ کے استعمال میں انہیں کمال حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں زبان کا حسن دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ان کی زبان میں سادگی کا حُسن اور حُسن کی سادگی ہے جو دلوں میں جگہ بناتی ہے۔ الفاظ کے مناسب اور متناسب استعمال پر وہ پوری قدرت رکھتے ہیں اور اسی کی بدولت ان کے ہاں ہر جگہ ایسی شعریت پیدا ہوتی ہے جس کا اثر اس پر ہوتا ہے اور جس سے ایک عجب طرح کی لذّت پڑھنے والے کو محسوس ہوتی ہے۔ فدؔا صاحب کو فارسی زبان پر

پوری قدرت حاصل تھی اور وہ فارسی کے بھی اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ فارسی کی مزاج دانی نے ان کی اردو شاعری میں بڑا رچاؤ پیدا کیا ہے اور اس میں ایسی رنگینی اور رعنائی، شگفتگی اور شادابی پیدا کی ہے جو شاعری کی جان اور شعریت کی پہچان ہے۔ فدا صاحب نے اُردو اور فارسی کی روایت کو شیر و شکر کرکے اپنی شاعری میں ایک ایسا سنگم بنایا ہے جو انہیں ایک اعلیٰ درجے کا شاعر ثابت کرتا ہے۔

فدا صاحب کی شاعری کی یہ خصوصیت ان کی کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے یہ تو ان کا مزاج ہے جس کا اظہار بڑے سلیقے سے ان کی شاعری میں ہوا ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ فدا صاحب نے جس تہذیبی ماحول میں آنکھ کھولی، اور جس کے سائے میں ان کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔ اس میں فارسی اور اردو کی تہذیبی روایت کا متوازن اور حسین امتزاج نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ شاعری میں اس روایت کے سب سے بڑے نمائندے اس زمانے میں اقبالؔ، حسرتؔ اور یگانہؔ، اصغرؔ اور جگرؔ تھے۔ ان سب کی غزلوں میں یہ رجحان اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ فدا صاحب کی شاعری بھی اسی راستے پر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فدا صاحب زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں لیکن صرف زبان کے استعمال ہی کو شاعری نہیں سمجھتے۔ ان کی شاعری میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں ان کے جذبات و احساسات کا لہو دوڑتا ہوا نظر آتا ہے اور ان کے شعور و آگہی کی گرمی بھی محسوس ہوتی ہے انہوں نے حسن و عشق کے مختلف تجربات کا اظہار بڑے خلوص اور صداقت کے ساتھ کیا ہے ان کی غزلوں میں انسان کے لطیف ترین جذبات کی ترجمانی ہے، لیکن ان جذبات کا اظہار ان کے ہاں بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں ہوا ہے۔ وہ کہیں بھی تہذیب اور شائستگی کے حدود سے باہر نہیں نکلے۔ داغ کے ہاں ان جذبات کی ترجمانی میں کھل کھیلنے والا انداز ملتا ہے، وہ فدا صاحب کے ہاں نہیں ہے۔ حسرت کے ہاں ان جذبات کی ترجمانی میں جو بے باکی ہے، وہ بھی ان کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ محبت اور جذب و شوق کی ترجمانی میں بہت کچھ کہتے ہیں لیکن ایک ایسے انداز میں کہتے ہیں کہ تہذیب و شائستگی کو

کہیں بھی ٹھیس نہیں لگتی۔ وہ بڑے ہی ثقہ شاعر ہیں بہت لئے دیئے رہنے والے شاعر ہیں۔

فداؔ صاحب کے زمانے میں جدید غزل میں دو رجحانات نمایاں تھے۔ ایک تو داغؔ کے اثر سے ایسے جذبات کی ترجمانی جن میں حقیقت کا رنگ و آہنگ تو ہے لیکن یہ رنگ و آہنگ اپنے حدود سے کچھ تجاوز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرے حالیؔ اور اقبالؒ کے اثر سے تہذیب و شائستگی کا وہ رجحان جو ان جذبات کو اپنے حدود میں رکھتا ہے اور ان میں لطافت اور سنجیدگی کی ایک ایسی فضا نظر آتی ہے جو غزل کی صنف کو مہذب بناتی ہے اور جذبات کو ابھارنے اور مشتعل کرنے کی بجائے ان کی تہذیب کا کام انجام دیتی ہے۔ فداؔ صاحب داغؔ کے شاگرد ہونے کے باوجود اپنی شاعری میں آخر الذکر رجحان کے ترجمان نظر آتے ہیں۔

اور یہی ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر محمد معز الدین[۱]

شاعرِ باکمال

حضرت سید عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی

محبِّ گرامی منصور عاقل صاحب نے ایک مرتبہ دورانِ گفتگو کچھ اشعار سنائے۔ ان میں سے دو اشعار دل میں اُتر گئے ؎

ہوا ہے کون سرگرمِ تبسم — کہ پھولوں کو پسینہ آرہا ہے
مری چھوٹی ہوئی نبضوں سے پوچھو — کہ ان کے ہاتھ سے کیا جا رہا ہے

ان اشعار کی برجستگی، ندرتِ فکر اور ان کے حسنِ تغزل اور منفرد اندازِ بیان سے میں بے حد لطف اندوز ہوا۔ شاعر کی نکتہ آفرینی اور قادرالکلامی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ محض دو اشعار سے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ کسی بلند پایہ استاد کے جوہر پارے ہیں۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ یہ ان کے نانا حضرت فدا گلاؤٹھوی کے اشعار ہیں۔ کچھ اور کے جواب میں ایک شعر اور مرحمت فرمایا ؎

کبھی ہے رُخ کی کبھی گیسوؤں کی بات پڑی — کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

۱۔ سابق ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی و سیکریٹری نیشنل ہجرہ کونسل اسلام آباد

ہرچند کہ یہ شعر داغؔ کے رنگ کی غمازی کر رہا ہے اور حضرت فداؔ نے استاد کے طرزِ کلام کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، مگر حق یہ ہے کہ ایں آوازے دیگر است .....

ان اشعار کی چاشنی کے بعد ان کے کلام کی طلب اور بڑھ گئی۔ حسنِ اتفاق کہ حال ہی میں منصور عاقلؔ صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے اپنے نانا مرحوم حضرت فداؔ گلاؤٹھوی پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ عاقلؔ صاحب خود بھی اچھے شاعر ہیں اور شعر گوئی اور سخن فہمی کا نہایت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اس مقالے میں انہوں نے فداؔ صاحب کی شاعری کا ہر پہلو سے جائزہ لیتے ہوئے ان کے اشعار کا عمدہ انتخاب کر کے ایک حسین و جمیل گلدستہ تیار کر دیا ہے۔ اس کے مقالے سے میں نہایت محظوظ اور خوش وقت ہوا۔ گو اس مقالے کے بعد اب کچھ اور کہنے کی گنجائش باقی نہیں مگر میں اپنے تاثرات و انبساط کا اظہار خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

اردو غزل کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے فرمایا تھا کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ فداؔ صاحب کے کلام کو دیکھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کی غزلوں میں روحِ تغزل کی کارفرمائی، خیالات کا بانکپن، جذبات کی صداقت، ندرتِ اظہار، معانی میں گہرائی، الفاظ کا برمحل استعمال اور سب سے بڑھ کر عرفانِ ذات اور عرفانِ شعور کی عکاسی دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ان جیسے مقتدر اور قادر الکلام شاعر نے بلاشبہ اردو غزل کے دامن پہ آنچ نہیں آنے دی۔ اور نہ صرف اس کی آبرو، نکھار اور حسن کو برقرار رکھا بلکہ افقِ شاعری کو وسیع سے وسیع تر کرنے اور دامنِ سخن کو گلہائے رنگا رنگ سے بھرنے اور اس کی بوقلمونی بڑھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ جملہ اصنافِ سخن، غزل، حمد، نعت، منقبت سے لے کر تاریخ گوئی تک کو اپنے فکر کی جولانگاہ بنا کر اور بلندیِ تخیل اور ندرت و تازگیِ بیان سے اس کے حسن و جمال میں چار چاند لگا دیئے۔

حضرت فداؔ بدیہہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، منصور عاقلؔ صاحب نے ان کے کمال فن کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مزید مثالیں پیش کرنا لاحاصل ہے۔ علامہ اقبال کے 'شکوہ' کے جواب میں علامہ سے پیشتر 'جواب شکوہ' اسی زمین میں لکھنے والا شاعر کتنا باوقار اور قادر الکلام ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ خود قارئین منصور عاقلؔ صاحب کی پیش کردہ مثالوں سے کر سکتے ہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔

حضرت فداؔ گلاؤٹھوی حیرت انگیز طور پر زبان و بیاں پر عالمانہ اور حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی ان کو استادانہ کمال حاصل تھا۔ امیر خسروؒ کی طرف منسوب مشہور نعتیہ غزل 'شب جائے کہ من بودم' کی زمین میں اور اسی رنگ میں جو غزل انہوں نے کہی ہے اس پر امیر خسروؒ ہی کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف دو اشعار پیش خدمت ہیں:

بجانم طرفہ مشکل بود، شب جائیکہ من بودم
بہ دستش دامنِ دل بود، شب جائیکہ من بودم
گہے دلبر بہ دل بود و گہے دل بود در دلبر
بیک جاں دلبر و دل بود، شب جائیکہ من بودم

دراصل حضرت فداؔ گلاؤٹھوی کی شاعری کے تانے بانے تصوف اور معرفت حقیقی سے بنے گئے ہیں جس کا دل اپنے حقیقی دلبر سے اس قدر قریب ہو اور جو اپنے محبوب حقیقی سے ہمکلام و سخن آرا ہو اس کے کلام کی رفعت اور اثر آفرینی کا کیا کہنا۔ از دل خیزد بر دل ریزد کی مثال ایک ایک شعر دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور حسن سخن کو آئینہ عطا کر کے لطف کلام کو جلا بخشتا ہے۔

غرضیکہ حضرت فداؔ گلاؤٹھوی کا شمار ان اساتذۂ کرام میں ہوتا ہے جن کو ہم استاذ الاساتذہ کہتے ہیں۔ میں منصور عاقلؔ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایسے سربرآوردہ استادِ سخن کے کلام سے قارئین کو روشناس کرا کے اور از سر نو ان گم شدہ لعل و گہر

کو اہل نظر کے سامنے پیش کر کے اردو شعر و ادب، کے مزاج دانوں پر بڑا اکرم فرمایا ہے۔ ایسے بلند اشعار وقتی طور پہ لوگوں کی نظروں سے ہماری غفلت اور کم نگاہی سے اوجھل تو ہو سکتے ہیں مگران کی آب و تاب اور ان کے رنگ روپ زمانے کے سامنے جلوہ آرا ہو ہی جاتے ہیں ۔

نگاہیں کاملوں پہ پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

محمد اصلح الحسینی

بیادِ سیّد عبدالوحید فداؔ مرحوم

مولوی سید عبدالوحید فداؔ مرحوم سید حیات اللہ مرحوم کے صاحبزادے تھے جو دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے تحصیلدار اور دینی منزلت کے اعتبار سے نقشبندی بزرگ اور تصوف کے چاروں سلسلوں کی نسبت سے مشرف تھے اور قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے خاندان متویان کے چشم و چراغ تھے۔ فداؔ مرحوم اور ان کے بڑے اور چھوٹے بھائی عبدالعزیز اور عبدالرشید واسطی نے گلاؤٹھی کے مشہور عربی مدرسہ منبع العلوم میں تعلیم حاصل کی تھی یہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا تھا ان کے داماد پیرجی عبداللہ اس کے مدرس اعلیٰ اور میرے دادا مولوی حاجی صوفی محمد حسن نقشبندی اس کے مہتمم اور مدرس فارسی تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد اور نواسے محمد میاں منصور فداؔ صاحب کے ہم درس اور فارسی میں محمد حسن مرحوم کے شاگرد تھے۔ قصبہ کے ایک رئیس منشی مہربان علی مدرسہ کے ابتدائی سرپرست تھے ان کے داماد منشی صفی اللہ مرحوم سے بھی فداؔ صاحب کا یہی تعلق تھا۔

حافظ محمد احمد دارالعلوم کے مہتمم ہوئے اور محمد میاں منصور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں جو ریشمی رومال کی تحریک کے عنوان سے مشہور ہے کابل چلے گئے۔ فداؔ صاحب نے صوفی

محمد حسن نقشبندی کے علاوہ محمد حسین یقین سے بھی تعلیم حاصل کی تھی جو امام بخش صہبائی کے ارشد ترین تلامذہ میں تھے اور شاید انہیں کے توسط سے فدا صاحب نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ محمد حسین یقین گلاؤٹھی کے ایک بہت ہی ممتاز بزرگ حاجی فدا علی کے صاحبزادے، اور صوفی محمد حسن نقشبندی کے ہم زلف تھے۔ عربی اور فارسی کے ممتاز فضلا میں شمار کئے جاتے۔ شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ سر سید مرحوم نے اپنے عہد کے فضلا میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ میرے والد مرحوم مولوی محمد صالح نقشبندی چشتی نے مجھے ان کے ایک دو شعر سنائے تھے اور طب کی ایک کتاب پر ان کے عربی حواشی دکھائے تھے۔ شعر تھے ؎

سب جان کے ہیں خواہاں کر لو اسے یقین تم
یہ آشنائے صورت بیگانے آدمی ہیں

قدم آہستہ رکھئے دیکھئے ٹھوکر نہ لگ جائے
کہیں دامن نہ الجھے آپ کیسی چال چلتے ہیں
نکالی راہ شانے سے ہٹی جب زلف چہرے سے
جھک کر مانگ بولی ناز سے اب ہم نکلتے ہیں

یہی محمد حسین یقین مرحوم فدا صاحب کے پہلے خسر تھے اور فدا صاحب کے ذوق شعری کے پہلے مربی جن کا فیضان شعری نسبتی اولاد کی طرح صلبی اولاد میں بھی منتقل ہوا۔ خود صاحب دیوان تھے اور ان کے داماد فدا صاحب کی طرح ان کی اولاد میں شمس الحق خیال، انوار الحق کمال، منظور الحق جو سب صاحب دیوان شعراء تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے ماحول میں ادب و شعر کی شمع روشن رکھی جو عرصہ تک ادب کے ویرانوں میں گورستان کے چراغ کی طرح جھلملاتی رہی یا بقول منصور عاقل شبستان ادب و شعر میں چراغ تہہ داماں کی طرح اپنی ہی روشنی میں جذب ہو کر رہ گئی۔ محمد حسین یقین اور خیال کا کلام خیال کے صاحبزادہ ظہور الحق کے پاس جو یقین ہی تخلص کرتے تھے محفوظ تھا جو ممکن ہے تنویر الحق دہلی کے پاس بھی میراث پدر کے طور پر

محفوظ ہو۔ خیال نے اپنے والد یقین کے بعد امیراللہ تسلیم سے استفادہ کیا تھا۔ رام پور کے ایک قدیم ادبی مجلہ "جلوۂ یار" میں جو صرف معاصر شعراء کے منتخب کلام شائع کرتا تھا۔ حضرت فدا اور خیال کا بھی کلام شائع ہوتا تھا۔ کمالی نہایت پرگو اور بدیہہ گو شاعر تھے جس روانی سے وہ تقریر کرتے اسی روانی سے شعر کہتے تھے ان کی باتیں اکثر منظوم مصرعے ہوتے تھے جس طرح شمس الحق خیال مرحوم نے رام پور میں سکونت اختیار کر لی۔ کمالی بہار کے ایک قصبہ باڑا میں بس گئے اور جود ٹانگر منتقل ہو گئے تھے۔ فدا مرحوم بھی غالباً اپنی اہلیہ اور خسر محمد حسین یقین کی وفات کے بعد بہ سلسلہ ملازمت مین پوری چلے گئے جو عہد تغلق میں مومن پور کے نام سے فوجی مستقر تھا جہاں پٹھان فوج کے ساتھ ان کے کنبے بھی آباد ہو گئے تھے۔

فدا صاحب کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسری شادی مولوی عطائے کریم کی بہن سے ہوئی جس سے ان کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئے۔ نواب حسن شمیم، ابن حسن، شبیر حسن، عزیز حسن عزیز، اقبال حسن قسیم اور بیٹیاں تلمیذ اور نوازی یہ سب شعر و سخن کا بہترین ذوق رکھتے تھے انہیں عطائے کریم کی دوسری بہن کی میرے چھوٹے دادا احمد حسن سے شادی ہوئی جن کی بڑی بیٹی کبریٰ منصور عاقل کے والد قاضی حبیب اللہ صاحب مرحوم کی پہلی بیوی اور رحیم اللہ قابل کی والدہ تھیں، ان کی وفات کے بعد فدا صاحب کی بڑی بیٹی تلمیذ فاطمہ ان کے نکاح میں آئیں یہ منصور عاقل کی والدہ تھیں اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتی تھیں۔ چھوٹی بیٹی نوازی مرحومہ کی شادی قابل صاحب سے ہوئی جن سے ایک صاحبزادے مختار شاغل یادگار ہیں۔

فدا مرحوم کے خاندانی تعلقات کی اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس علمی اور ادبی فضا میں ان کی ذہنی نشو و نما ہوئی تھی وہ کس قدر ادب پرور تھی اس فضا کو انہوں نے نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کو ترقی اور وسعت دی عمودی بھی اور آفاقی بھی۔ یقین، صہبائی اور نواب مرزا داغ کی ادبی تربیت سے استفادہ کر کے وہ تسلیم و اعتبار کی اس بلندی تک پہنچے کہ داغ کے نورتنوں میں شمار ہوئے اور ان کے جانشین تسلیم کئے گئے۔ فدا کے شاگرد اور استفادہ کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن میری معلومات کی حد تک رحیم اللہ قابل کے سوائے کوئی شاگرد ان کے ذوق تربیت کی تسکین کا سامان فراہم نہ کر سکا اس جوہر قابل کا انہیں اعتراف بھی تھا اور اس کی تربیت پر فخر بھی منصور عاقل نے اپنے مقالہ میں اس کا حوالہ دیا ہے قابل

میرے والد کی چچا زاد بہن اور والدہ کی پھوپھی زاد بہن کے بیٹے تھے۔ شادی سے پہلے تک انہیں شعر و سخن سے کچھ مناسبت نہیں تھی۔ فداؔ صاحب پنشن کے بعد گلاؤٹھی آئے اور بیٹیوں کی شادی کی تو چھوٹی بیٹی کے تعلق سے قابلؔ صاحب سے ان کا ربط قائم ہوا اور پھر تو گویا دبستان کھل گیا۔ محمد حسین کی طرح انہوں نے بھی اپنے قابل داماد کی تربیت کی۔ انہیں کی زیر تربیت قابل اس مقام تک پہنچے کہ نغز گوئی اور بدیہہ گوئی میں ان کا جواب نہ تھا۔ وہ روزنامہ وطن دہلی کے لیے مسائل امروز کی مناسبت سے روزانہ قطعات و رباعیات لکھتے اور موقعہ ملتا تو مشاعروں میں اپنے حسین تغزل سے تحسین و داد حاصل کرتے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں الجمعیۃ دہلی کے ادارہ تحریر سے منسلک رہنے کے دوران میں کبھی کبھی ان سے ملتا تو بعض اوقات ان کی غزلیں بھی سنتا تھا۔ ایک دو شعر اب بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہیں ؎

اک ہم ہیں کہ یادِ ماضی میں تر دامن ہیں خوں روتے ہیں
اک تم کہ وداعی آنکھوں کی دو طرفہ نمی بھی یاد نہیں

یہ پچھلی شب، یہ سناٹا، قابلؔ یہ قیامت بیداری
کچھ ذکر کرو، کیا آج تمہیں ورد سحری بھی یاد نہیں

ہزاروں ہزار اشعار کہنے اور لکھنے کے، باوجود تاریخ کی گرد میں وہ بھی اسی طرح روپوش ہوگئے جس طرح ان کے پیشرو گلاؤٹھی کے دوسرے صاحب کلام شعراء یقینؔ، خیالؔ، کمالؔ، ناطقؔ، امیر حسن شوقؔ، امیر حسن اسیرؔ، مضطرؔ وغیرہ مرحومین دو آبگنگ وجمن میں ادب و شعر کے ارتقا کی تاریخ کا بھولا ہوا افسانہ بن گئے تھے۔ نمونہ کے طور پر ان میں سے ہر ایک کے کلام کے کچھ اشعار ذہن میں محفوظ ہیں ان کے ذکر کا موقعہ نہیں ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

عاقلؔ کی خوش بختی ہے کہ پینتالیس برس کے بعد انہوں نے فداؔ مرحوم کے چہرہ سے نقاب اٹھانے کی ہمت کی ہے۔

فداؔ مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے بلکہ شعر و ادب کی دُنیا میں اپنے خواجہ تلاش تلامذہ داغ

کی طرح ہنگامہ پرور شخصیت تھے یمن پوری میں رہے تو وہاں ہنگامہ شعر وسخن برپا رکھا پنشن کے بعد گلاؤٹھی آئے تو یہاں کی اداس اور افسردہ فضا میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ گلاؤٹھی کے علاوہ ہاپوڑ، بلند شہر، خورجہ اور میرٹھ وغیرہ قرب وجوار کے قصبات اور شہروں میں شعر وسخن سے دلچسپی رکھنے والے ان کی طرف متوجہ ہو گئے وہ مشاعرے منعقد کرتے اور ان میں شریک ہونے والے شعراء کے کلام کی اصلاح کرتے تھے۔ میں نے انہیں بیک وقت دس دس شعراء کے کلام کی اصلاح کرتے دیکھا ہے۔ وہ بہ ترتیب ان کے شعر سنتے اور ہر ایک کو اس کے تسلسل غزل اور مزاج غزل کی رعایت کے ساتھ اصلاحی مصرعہ یا شعر املا کراتے رہتے تھے۔ اصلاح کلام کی ایسی ہی ایک مجلس سے گذرتے ہوئے ان کا ایک اصلاحی شعر میں نے سنا تھا جو وہ اپنے ایک عقیدت مند شاگرد شمس ہاپوڑی کو املا کرا رہے تھے۔ شعر دلچسپ معلوم ہوا یاد رہ گیا۔

بولتا ہے مری شیرین سخنی کا طوطی
شمس مشہور جہاں میں مری تبریزی ہے

میں بھی کبھی ان کی مجلسوں کو دیکھتا گذرجاتا اور اپنے دل میں شعر گوئی کی تحریک محسوس کرتا تھا۔ ایک دو مشاعروں کے لیے بھی غزلیں لکھیں اور اصلاح کے لیے پیش کیں لیکن اردو شعر گوئی سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ بعض اوقات فارسی میں کہنے کی کوشش کی اور ان کی اصلاح سے استفادہ کیا۔ ایک مرتبہ اپنی فارسی غزل کا مطلع عرض کیا:

نفسے زمن نہ گنجد بہ فضائے دو جہانے
کہ منم نہفتہ رازے بہ ضمیر لامکانے

اس غزل میں ان کی اصلاح سے مزین شعر یہ تھا اپنی بندش یاد نہیں رہی۔

زوفائے من چہ پرسی زلقائے من چہ دانی
کہ ہزار نقش دارد بہ جبینم آستانے

اس تسلسل میں تفصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک واقعہ کا ذکر شاید غیر مناسب نہ ہوگا۔
ابھی فارسی ہی پڑھتا تھا کہ عرفی جیسے بلند خیال اور فلسفہ طراز شاعر کے ایک شعر پر اپنی تنقید و

تو میں ان کی خدمت میں عرفی کا شعر عرض کیا تھا؂

با دوست چو رازِ خویش گویم

از خانہ بروں کنم صبا را

میں نے کہا یہ کیسی رازداری ہے کہ خود بھی موجود ہے دوست بھی اور صبا بھی جس کو گھر سے نکالا جا رہا ہے مجھے تو شعر یوں اچھا معلوم ہوتا ہے؂

با خویش چو رازِ دوست گویم

از سینہ بروں کنم ہوا را

فدآ صاحب نے پسندیدگی کی وجہ دریافت کی تو عرض کیا کہ یہاں صرف راز دوست ہے اپنے آپ سے بھی کہتا ہے تو خواہش و آرزو کو سینہ سے نکال دیتا ہے یا خود مٹ جاتا ہے ہوا تارِ نفس بھی ہے اور خواہش کے معنی میں بھی ہے یہ سن کر فرمایا "صاحبزادے جینے کی باتیں کرو" میں اب تک بھی نہیں سمجھ پایا کہ یہ تحسین تھی یا تادیب۔ اگر تادیب و تنبیہہ کے طور پر فرمایا تھا جس کا قرینہ میری نوعمری اور میرا مبلغ علم تھا تو اس سے ان کے سنجیدہ طریق تہذیب و تربیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا انداز تعریض و تنقید بھی کچھ ایسا ہی تھا وہ شرافت و ثقاہت کا ایسا پیکر تھے کہ معاشرت اور شعر و ادب یا شاعری و سخن آرائی کی ہنگامہ پرور زندگی میں ان کی زبان و قلم سے کبھی کوئی لفظ اپنے دور کی تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ معیار سے گرا ہوا سرزد نہیں ہوا۔ اس درویشانہ سنجیدگی میں کوئی معاصران کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ اک پُر وقار سنجیدگی ان کی میراث معلوم ہوتی تھی جو ان کے معاصرین اور چھوٹوں کو ان کے سامنے مؤدب رکھتی اور بے تلقین و تنبیہہ ادب سکھاتی تھی۔

فدا صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالرشید واسطی آسؔ بہترین خطاط تھے فرمایا کرتے تھے "ما ئیم واسطی و قلم نیز واسطی"، میں نے ان سے تحریر کی اصلاح لی ہے۔ کم سخنی کے ساتھ مزاج میں نزاکت تھی کبھی کبھی گھور دیا کرتے تھے۔ تاریخ گوئی میں اپنے بھائی فدآ صاحب کی طرح بڑی دسترس حاصل تھی۔ دونوں کے طرز نگارش میں زبان اور اسلوب بیان کی یکسانیت تھی۔ بڑی دلکش تاریخ کہتے تھے۔

فدآ صاحب کا ذوق تنقید و تعریض بڑا صاف ستھرا اور انوکھا تھا۔ اپنی پوری سنجیدگی کو برقرار

رکھتے ہوئے بے تحقیر و تضحیک قابل تنقید ترکیب یا ناگوار لفظ کو صرف دہرا دیتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ میں "لشکر کفار پہ دوڑ سے" کی ساخت میں "پہ دوڑے" اور اہل چین چین میں کی ترکیب جملہ میں چین چین کے الفاظ دہرا دیتے۔ یہ دلربا اسلوب تنقید نہ صرف ان کی ثقاہت و شائستگی کا ترجمان تھا بلکہ شعر و ادب میں نغمگی اور حرف و صوت کی ہم آہنگی کی رعایت میں ان کے ذوق کی نفاست کا بھی آئینہ دار تھا۔

فدا صاحب کے منتخب کلام میں جو ان کے نبیرہ محبوب واسطی اور نواسے منصور عاقل نے انتخاب کیا ہے جستہ جستہ اشعار میں تصوف کا رنگ اور عارفانہ مضامین دیکھ کر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ بہت سے اساتذہ فن کی طرح "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کے نقطہ نظر سے زینت کلام کے لیے اس کو اپنایا گیا ہے مگر شاید کم لوگ جانتے ہوں کہ وہ صحیح معنی میں صُوفی تھے۔ یہ ذوق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ وہ صاحب نسبت نقشبندی باپ کے بیٹے تھے۔ ایک صاحب اجازت نقشبندی شیخ صُوفی محمد حسن کے شاگرد اور منبع العلوم مدرسہ کے صاحب نسبت اساتذہ کے فیض یافتہ بزرگ تھے اپنے ایک اور استاد اور خسر محمد حسین یقین کے والد فدا علی کی روحانی عظمت اور بزرگی سے متاثر ہو کر دادا خسر کے نام کو تخلص کے طور پر ابتدا ہی میں اپنا لیا تھا بعد میں غالباً قیام مین پوری کے دوران وہ شاہ نیاز بے نیاز کے سلسلہ ارادت میں منسلک ہو کر فدائے نیازی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

ایک موقعہ پر میلاد نبویؐ سے متعلق میرے ایک طالب علمانہ مضمون سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہو گئے۔ اور ایک فیض بخش نظر التفات سے میری طرف دیکھ کر فرمانے لگے۔ تمہارے دادا نقشبندی بزرگ تھے جو تمہاری پیدائش سے پہلے واصل بحق ہو گئے مگر تمہارے مزاج کو چشتیت سے مناسبت ہے۔ سولہ سترہ برس کے ایک نوعمر طالب علم کے لیے اس وقت یہ بات ایک معمہ تھی اب غور کرتا ہوں تو ان کی ژرف نگاہی کو محسوس کرتا ہوں کچھ ہی عرصے بعد مجھے شیخ الاسلام حضرت شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ کے توسط سے چشتی اور نقشبندی قادری وغیرہ سلاسل تصوف سے وابستگی کا شرف حاصل ہوا ان کے نیازی سلسلہ سے استفادہ مقدر نہ تھا مجھ سے انہوں نے اپنے روحانی مشاہدات سے متعلق باتیں کی تھیں جن کے ذکر کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ان کے صاحبزادے قسیم نیازی اس کے بعد سے مجھے مدنی کہہ کر یاد کرتے رہے۔

ان واقعات کے حوالے سے میں پوری بصیرت اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ برائے شعر گفتن نہیں تھا۔ ان کا وجدان، واردات، حال اور مشاہدات کا تاثر تھا۔ ان کے ذوق تربیت کی بے تابی، فیض بخشی اور ابلاغ کی کسک میں خدمت شعر و سخن کے ساتھ روحانیت کی چسک بھی ایک موثر عامل کی حیثیت رکھتی تھی۔ عاقل کے انتخاب ہی سے میں ایک دو شواہد پیش کر رہا ہوں اس مقالہ کے علاوہ اور یادوں کی راکھ سے کریدی ہوئی چنگاریوں کے سوائے کوئی مواد میرے پاس نہیں ہے جو کچھ لکھا ہے اس عالم میں لکھا ہے کہ عاقل کا اصرار تعجیل سر پر سوار ہے فرماتے ہیں:

اک دہن سے رہے دنیائے محبت آباد
میری ہر سانس اویس قرنی ہو جائے

نعمتیں اتنی ملیں تیرے فدؔا کو یا رب
ورد ہر سانس کا اللہ غنی ہو جائے

غالباً یہ ابتدائی کلام کا حصہ ہے۔ نقشبندیہ اور چشتیہ کے شغل "پاس انفاس" اور طلب عشق کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

مست مئے وصال کی پیاس ابھی بجھی نہیں
بادہ ساغر ازل جام سوال میں بھی آ

قرب کی تجلیات سے تلذذ اور طلب مزید کی تڑپ محسوس ہوتی ہے۔

اے رخ جلوۂ فنا میں ہوں اور آئینہ ترا
بن کے جلالت فدؔا صورت حال میں بھی آ

تحیر ادراک اور طلب فنائے احوال و مقامات۔ اسی حال کا ایک اور شعر سنئے:

ہمارا ہوش رفتہ بے نشانی کا نشاں کیوں ہو
ترے ذکر خفی کی بے خودی بھی رازداں کیوں ہو

مرے یقیں میں نہیں یا مرے گماں میں نہیں
ترا جمالِ دل افروز کس مکاں میں نہیں

تلاشِ ہستیِ آوارہ سے خدا حافظ
کہیں ٹھکانہ ترا عمرِ رائیگاں میں نہیں

تجلیات کو اے خلوتی نہ کر محدود
وہ ہر مکاں میں ہے کون سے مکاں میں نہیں

فنائے کامل کے بعد حصول بقا کا حال بھی سن لیجئے :

یہی مآلِ فنا ہے یہی کمالِ فنا
کہ ان کی آنکھوں سے اب ان کو دیکھتا ہوں میں

مشاہدہ نفسی و آفاقی، طلبِ فنا بسیط کہ ابھی احساسِ فنا باقی ہے۔
عاقل کے تحقیقی مقالہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بس اسی پہ اکتفا کرتا ہوں۔

"شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد"

ورنہ اس منتخب کلام میں بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں کہ

"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست"

سید عبدالوحید فدآ مرحوم ان احوال و واردات کے اعتبار سے میری معلومات کی حد تک اپنے اعزہ و احباب اور معاصرین میں بالکل منفرد تھے۔ وحدت ان کے نام میں شامل تھی ان کا جزو ذات اور طرۂ امتیاز تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب دلکش تضاد تھا شعر و سخن کی مجلسوں میں سرگرم دلچسپی کے باوجود بے مقصد محفل آرائی سے سخت اجتناب کرتے تھے۔ میں نے انہیں زندگی کے آخری عشروں سے گذرتے دیکھا ہے پر وقار سنجیدگی ان کا ایسا لباس تھا جو کبھی لباس شب سے تبدیل نہیں ہوتا تھا۔ گھریلو زندگی میں بھی خاموش ہی رہتے تھے۔ فکر شعر کے علاوہ بھی ان پر ایک گہرے تفکر کی کیفیت طاری رہتی۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں اپنی تنہائی کا احساس بھی تھا۔ یاس انگیز حساس تنہائی نہیں جو ہمارے دور کی جدید حسیت کی نامبارک عطا ہے

زندگی سے فرار اور انسانی رشتوں سے انحراف کی تعبیر ہے۔ خود مرکزیت اور شدت وجارحیت کی اساس ہے بلکہ ایک سکون بخش جمال آفرین اور جلوہ آرا تنہائی جو حضور دوام کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور سکینۂ قدس بن کر نازل ہوتی ہے۔ خود انہیں کا ایک شعر ہے جو میں نے اسی زمانہ میں سنا تھا۔ واقعی وہ مُوتُوا قَبلَ ان تَموتوا کی تفسیر تھے۔ انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ گوشۂ تربت میں تنہا سو رہے ہیں:

کنج تربت میں مرے ساتھ ہیں لاکھوں جلوے
بیکسی تجھ کو یہ دھوکا ہے کہ تنہا ہوں میں

فدؔا مرحوم بڑی دلکش تاریخ کہتے تھے۔ تعمیہ یا تخرجہ کے ساتھ کہتے تو دلکشی میں مزید اضافہ کر دیتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی منشی عبدالعزیز مرحوم کے مکان اور کنوے کی تعمیر کی یہ خوبصورت تاریخ کہی تھی ؎

فدا چو مصرع تاریخ از کمیں پرسید
زقلب عجز بگفتہ غریب خانۂ ما

تاریخ میں تعمیہ ہے۔ قلب عجز یعنی جیم کے تین عدد شامل کر کے تاریخ بنتی ہے۔

مولانا محمد علی جوہرؔ کے سانحۂ رحلت پر فدؔا مرحوم نے ایک مسدس مرثیہ لکھا اور حیات جاوید کے نام سے کتابچہ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ تاریخ وفات سے متعلق شعر تھا:

حق نے سر توڑ کے باطل کا یہ بخشا ہے وقار
"آپ جنت میں بھی کہلائے رئیس الاحرار"

تاریخ میں تخرجہ ہے۔ سر باطل یعنی حرف بؔ کے دو عدد مصرعہ تاریخ کے مجموعی اعداد سے نکال کر وفات کا سن ہجری برآمد ہوتا ہے۔

اسی صنعت تخرجہ میں دو عدد کے اخراج کے ساتھ وفات سے کچھ ہی پہلے والد مرحوم کی یہ خوبصورت تاریخ وفات ارشاد فرمائی تھی۔

تا ابد باد بآغوشش محمد صالح

مولوی فدؔا مرحوم کے چھوٹے بھائی عبدالرشید واسطی بھی اسی پرداز پر تاریخ کہتے تھے۔ زبان اور انداز میں بڑی یکسانیت تھی۔ موصوف نے فدا صاحب کی پہلی بیوی کے تعلق سے نسبتی بہن اور دوسری بیوی کے تعلق

سے سیلچ کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھا تھا جو میری نانی تھیں۔ اس قطعہ سے ان کے اور فداؔ مرحوم کے علمی ماحول پر روشنی پڑتی ہے اور ان اثرات کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کی علمی، ادبی، روحانی اور اخلاقی تربیت میں ایک مؤثر عامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ تاریخی حوالہ شاید بے موقع نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

زوجۂ مولوی عطائے کریم
خوش خرامید سوئے دار ثبات

چہ کنم وصف آں سعیدہ خصال
صالحہ مصلحہ ستودہ صفات

والدش یادگارِ صہبائی
جدِّ او بود سید السادات

بہ طفیل محمد و حسنین
بیں بہ بخشائے قاضی الحاجات

واسطی فکر کرد تاریخش
رمضاں شد شفیع ام بنات

ہاتفے از سر امید کرم
غفر اللہ گفت سال وفات

عطائے کریم الدنی فداؔ صاحب کی دوسری بیوی کے تعلق سے برادر نسبتی تھے، ان کی اہلیہ سعید النساء سے فداؔ کے رشتوں کا ذکر ہو چکا ہے وہ ان کے استاد اور خسر محمد حسین یقیںؔ کی صاحبزادی تھیں جو امام بخش صہبائیؔ کے شاگرد تھے۔ فدا علی یقیںؔ کے والد اور جلیل القدر روحانی بزرگ تھے جن سے فداؔ مرحوم کے والد حیات اللہ غیر معمولی عقیدت وارادت رکھتے تھے۔ انہیں کو سید السادات کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ حسنین میں دوسرے حسن صوفی محمد حسن نقشبندی ہیں جو واسطی اور فدا صاحب کے استاد تھے۔ انہیں محمد حسن اور محمد حسین کے توسل سے التجائے مغفرت کی گئی ہے۔ غفر اللہ مادہ تاریخ ہے جس میں امید کرم کے الف کا

تعمیہ یعنی ایک کے عدد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قطعہ میں مزید جن احوال کا اشارہ ہے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

تاریخ نگاری اور اس کے دل کش اسلوب سے ان کی مہارت فن اور زبان و بیان پر قدرت کا تو اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ ان کا اضافی وصف ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے ان کے تغزل پر تبصرہ اور ان کے معاصر غزل گو شعراء کے کلام سے موازنہ اور محاکمہ کئے بغیر ان کے خط و خال کی دلربائی اور قامت رعنا کی دلکشی کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ عاقل کے تحقیقی مقالہ میں جو انتخاب اور اقتباسات میرے پیش نظر ہیں ان میں فدا کے تغزل کا ارتقاء تو محسوس ہوتا ہے لیکن اس اعلیٰ روایتی تغزل کے متعلق اس انتخاب اور اپنی یاد کے حوالہ سے پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی متانت، جذبہ کی صداقت اور احساس کی نزاکت و نفاست کے اعتبار سے ان کا تغزل بے مثال تھا۔ ان کی شعری حسیت ابتذال سے پاک تھی جب کہ ان کے خواجہ تاش اور معاصر شعراء میں بلکہ ان کے خواجۂ سخن کے کلام میں اس کے چھینٹے نظر آتے ہیں۔ صرف ایک مثال سن لیجئے۔ جس محبوب سے طنزیہ خطاب ہے وہ کسی بالاخانہ کی زینت ہے جہاں تماشا بینی کے لیے لوگ روپ بدل کر آتے ہیں ؎

آپ کے گھر میں فرشتے تو نہیں تھے نازل
بھیس بدلے ہوئے بیٹھے تھے جو مہمان دو چار

ذاتی مطالعہ اور اپنی یادداشت کی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اصغرؔ اور فانیؔ کے سوائے کئی نے اپنے فاسقانہ تغزل کا اعتراف بھی کیا ہے۔ کلام فداؔ میں نہ کہیں فاسقانہ تغزل ہے نہ خمریات، نہ رندوں سے لپاڈگی ہے نہ تحقیر و تضحیک، جو ان کے دور کے تغزل میں مروج مضامین غزل تھے۔ ان کے کلام پر بھی تفصیلی تبصرہ اور تجزیہ میں عاقل کے تحقیقی مقالہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ تاریخ ادب کے اس مظلوم شاعر کا مکرر تعارف جس نے تقریباً نصف صدی پہلے کاروان شعر و ادب کو گرم سفر رکھا تھا، مقالہ نگار کے لیے سرمایہ سعادت اور آج کے سنجیدہ ادب کے لیے مشعل ہدایت ثابت ہوگا۔

سید عبدالوحید فداؔ مرحوم کے اس ذکر جمیل کے حوالہ سے "رحمت براں تربت پاک باد" ایک قلندر مشرب صوفی شاعر کے یہ شعر پڑھتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔ منصور عاقلؔ کا شکر گزار

ہوں کہ ان کے اصرار نے ایک عزلت گزیں کے زنگ خوردہ قلم کو روانی بخشی :

یہ کس مقام سے عمر گزشتنی گذری — وہ رُخ کی دھوپ وہ زلفوں کی چھاؤں بھی گذری

نظر ملا نہ سکے عاشقوں سے اہل خرد — رہ جنوں سے دبے پاؤں آگہی گذری

تمہاری یاد تھی یا دشمن بخیر دل کے ساتھ

وہ ایک بات تھی مدت ہوئی گئی گذری

سید منصور عاقل

سیّد عبدالوحید فدا اگلاؤٹھوی

(مکتبِ داغ کے ایک قادر الکلام شاعر)

اردو شاعری کا دامن بے حد وسیع ہے۔ دُنیا کے کسی بھی زبان و ادب کے مشاہیر سے ہم اپنے شعراء کا مقابلہ و موازنہ نہایت سرخروئی سے کر سکتے ہیں۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خود اردو زبان اپنی وسعت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اردو کے لسانی ارتقاء کی کہانی صرف ایک زبان کی داستان نہیں بلکہ اس میں ہندی و سنسکرت۔ فارسی و عربی و نیز بعض یورپی زبانوں کی نشو و نما کے قصّے بھی ملتے ہیں۔ اُردو شاعری کا کلاسیکی دور خاص طور پر شخصیتوں اور افکار کی بوقلمونی کے باعث ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کلاسیکی شعر و ادب کا سرمایہ معروف شخصیتوں اور ان کی نگارشات ہی کے حوالے سے اس قدر گرانمایہ ہے کہ ہم اُس پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہے۔ کاش ہمارے سرمایۂ افتخار میں اُن بزرگوں کی قلمی کاوشیں بھی شامل ہوتیں جن کے چہرہ سے تاریخ پردہ اُٹھانے سے قاصر رہی ہے۔ ایسی ہی ہستیوں میں اپنے نانا جناب سید عبدالوحید فدا مرحوم کو شمار کروں گا جنہیں آج ادبی تاریخ کے تسلسل کے حوالے سے شبستانِ شاعری کا چراغ تہہِ داماں قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو فدا صاحب کی شاعرانہ عظمتوں کا غلغلہ سُنا انہیں دیکھا تو صرف اس قدر کہ وہ آخری عمر میں صاحبِ فراش تھے اور فالج کے مرض میں مبتلا ہونے کے سبب چلنے پھرنے سے معذور۔ مجھے یاد ہے کہ گلاؤٹھی میں دُور دُور سے اُن کے شاگرد ان کی خدمت میں حاضر ہوتے جن میں ہندو شعراء بھی شامل تھے اور مسلمان بھی۔ یہ لوگ اپنے استاد کا جس قدر احترام کرتے ہم اس دور میں اُس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ بعض ممتاز ترین شخصیتوں کو میں نے فدآ صاحب کے پاؤں دابتے بھی دیکھا اِس ارادت و عقیدت کا اظہار اُن کے شاگرد موہن لعل شفقؔ جو قصبہ ہاپوڑ کے ایک متمول شخص تھے اور لاڈلی لعل لائقؔ جو اٹاوہ کے مشہور وکیل تھے خاص طور پر کرتے۔ گلاؤٹھی میں متعدد حضرات ایسے تھے جو باقاعدگی سے فدآ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ان میں محمد اسحٰق واصف بھی تھے جنہیں فدا صاحب اکثر اپنا تازہ کلام اِملا کراتے۔ شعر و شاعری سے شغف رکھنے والے لوگوں میں کم ہی ایسے لوگ تھے جو فدا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف بحور و قوافی میں غزلیں اِملا کرا کے نہ لے جاتے ہوں شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا سلسلہ تو گویا ایک ادنٰی بات تھی۔ اُستاد شاگرد کے درمیان فکری و شعری روابط کا یہ انداز کلاسیکی دور کی نمایاں خصوصیت ہے جس کے لیے مصحفی و انشاء خاص شہرت رکھتے ہیں خود داغؔ دہلوی کی قادر الکلامی اور شعر بخشی کا بھی یہی حال تھا جو اُن کے خاص تلامذہ میں جن میں فدآ صاحب شامل تھے ورثہ کی صورت میں منتقل ہوا بہرحال فدآ صاحب کی قادر الکلامی اور زُود گوئی کی داستانیں بھی اُن کے عہد میں عام تھیں اُن کے کلام کا جو کچھ بھی حصّہ ہمیں میسّر آسکا ہے وہ موجودہ حالات میں اُن کی یاد کو تازہ رکھنے اور اُن کی شاعرانہ عظمتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے غنیمت ہے۔

میرے بڑے بھائی مرحوم علّامہ سید قابلؔ گلاؤٹھوی شاعری میں فدا صاحب کے شاگرد تھے اور جانشین بھی۔ اُن کے بارے میں فدآ صاحب نے ایک جگہ کہا ہے ؎

قابلؔ مری کھلتی ہوئی کلیوں کا تبسم
شاداب اسی پھول سے گلزارِ فداؔ ہے

میں نے قابلؔ صاحب سے اکثر فداؔ صاحب کے اشعار سُنے اور اپنی والدہ مرحومہ سے بھی۔ جو خود ایک اچھا ادبی مذاق رکھتی تھیں اور کبھی کبھی شعر بھی کہتی تھیں۔ لہذا فداؔ صاحب کی شعرگوئی سے متعلق ابتداً میری معلومات اس سے زیادہ نہ تھیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں گورنمنٹ کالج میانوالی میں سیاسیات کا لیکچرر تھا تو کالج کی لائبریری میں ایک کتاب بعنوان "ترکش" میری نظر سے گزری۔ یہ کتاب احسانؔ دانش مرحوم کی مرتب کردہ تھی۔ جو مختلف شعراء کے منتخب اشعار پر مشتمل تھی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس کتاب میں میرے نانا فداؔ صاحب کا انتخاب کلام بھی موجود تھا۔ یہی نہیں بلکہ گلاؤٹھی کے دیگر شعراء کے کلام سے بھی انتخاب کیا گیا تھا جن میں مشتاق علی مضطر مرحوم اور سید امیر حسن امیرؔ گلاوٹھوی شامل تھے "ترکش" میں فداؔ صاحب کے جو اشعار دیئے گئے تھے اُن میں سے مندرجہ ذیل دو شعر مجھے ہمیشہ یاد رہے ؎

ہوا ہے کون سرگرمِ تبسم
کہ پھولوں کو پسینہ آرہا ہے

مری چھوٹی ہوئی نبضوں سے پُوچھو
کہ اُن کے ہاتھ سے کیا جا رہا ہے

چنانچہ یہیں سے میری آتشِ شوق میں اضافہ ہوا اور مجھے آخرکار کراچی کے دورانِ قیام (۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء) فداؔ صاحب کا کچھ کلام حاصل کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اُن کے کلام پر مشتمل ایک رجسٹر مجھے اپنے ماموں زاد بھائی اور فداؔ صاحب کے پوتے سید مشیر حسن واسطی سے ملا جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں اس میں فداؔ صاحب کا بیشتر اردو کلام اور کچھ فارسی کلام غالباً اُن کے اپنے خط میں لکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ اساتذۂ قدیم کا طریقہ تھا اُن کی اِس بیاض میں حروفِ تہجی کا اہتمام نظر آتا ہے۔ چنانچہ صفحۂ اوّل پر ردیف "الف" کے تحت

جو حمد باری تعالیٰ درج ہے اُس کا مطلع ہے ؎

رُخ آئینہ حیرت طلسمِ کن فکاں تیرا
بہارِ باغ قدرت رقصِ مُرغِ صبح خواں تیرا

اس کے علاوہ فدا صاحب کی ایک اور بیاض اُن کے حقیقی بھتیجے مرحوم سید خورشید حسن واسطی صاحب سے مجھے ملی جو میری والدہ مرحومہ کے عم زاد ہونے کی نسبت میرے ماموں تھے اور مجھ سے نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے دوسری اور پہلی بیاض میں اکثر غزلیں اور نظمیں مشترک ہیں تاہم دوسری بیاض انکے اضافی کلام پر بھی مشتمل ہے۔ ان دونوں بیاضوں سے انتخاب کرنا تنہا میرے لئے ممکن نہ تھا چنانچہ میرے کراچی کے دورانِ قیام میرے ماموں زاد بھائی سید محبوب حسن واسطی نے میری مدد کی جو ماشاٗ اللہ ایک عالم دین، محقق، نقاد اور ادیب ہیں۔ ہم دونوں نے مختلف نشستوں میں ان بیاضوں سے کچھ کلام انتخاب کیا جس سے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

بخش دے حشر سے پہلے اُسے اے داورِ حشر
اپنے قاتل کا نہ دیکھوں میں پشیماں ہونا

اپنے ہوتے ہیں پرائے شبِ تنہائی میں
یاد ہے شام سے سائے کا گریزاں ہونا

بے پروں اُڑتا ہے ہر ذرہ بیانوں کا
ہے جلوس آج ہوا پر ترے دیوانوں کا

تو ہی کہدے تجھے پیمانِ شکستہ کی قسم
کس کو میرا سا یقیں ہے ترے پیمانوں کا

بڑھ کے آئینہ دکھایا جو وفاؤں نے مری
منہ ذرا سا نکل آیا ترے احسانوں کا
آبلوں میں بھی نہ کچھ سوزِ دروں نے چھوڑا
گھر کا گھر پھونک دیا سوختہ سامانوں کا

یہ کیا ملا تری فرقت میں یہ تو کچھ نہ ملا
کہ ہاتھ آیا تو دامانِ انتظار آیا
جُھکا دیا سرِ رفعت ہوائے خجلت نے
چراغ بھی مری تربت پہ شرمسار آیا

ایک ہی پھول کی نکہت کا یہ صدقہ ہے کہ آج
پتہ پتہ کو ہے دعویٰ چمن آرائی کا
کشتۂ عشق نے شاید اسے مایوس کیا
چہرہ اُترا نظر آتا ہے مسیحائی کا

سوزِ پنہاں کی مرے آگ بُجھی جاتی ہے
اب سہارا ہے تو اک جنبشِ داماں تیرا
تیرا ہمدم کوئی دل ہے نہ تمنّا کوئی
آج کیا حال ہے اے زلفِ پریشاں تیرا

آئینہ کی بے محل ترکیب حیرت دیکھنا
کس کی صورت دیکھتا ہے اِس کی صورت دیکھنا

بخشا گیا تو اور خطا کار ہو گیا
میں شوقِ مغفرت میں گنہگار ہو گیا

تیرے بیمار پہ احسانِ مسیحا نہ ہوا
یہ بھی اچھا ہی ہوا کچھ کہ وہ اچھا نہ ہوا
وہی اُمید تھی میری جو بَر آئی نہ کبھی
وہی وعدہ تھا ترا جو کبھی پورا نہ ہوا
یاں بھی آئے تو وہ ڈالے ہوئے زلفوں کا نقاب
روزِ محشر بھی میری شب کا سویرا نہ ہوا

انتخاب کلام کا کام تو محبوب واسطی کی رفاقت میں شروع ہوگیا تھا لیکن میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اگر فدآ صاحب کی شاعری، اُن کی شخصیت اور اُن کے فن کے بارے میں کچھ لکھوں تو مجھے اُن کے عہد کے نمایاں رجحانات اور خود اُن کی شاعری کے پس منظر د پیشِ منظر کا علم ہونا چاہیئے جو مجھے اگر تھا بھی تو برائے نام۔ حد تو یہ ہے کہ مجھے فدآ صاحب کی تاریخ پیدائش کا علم تھا نہ تاریخِ وفات کا۔ یہی نہیں بلکہ فدا صاحب کے وطن گلاؤٹھی (ضلع بلندشہر) کے بارے میں تاریخی و تہذیبی پس منظر کا علم ہونا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ اُن مقامات کے بارے میں معلومات کا حصول جہاں فدآ صاحب بسلسلۂ معاش مقیم رہے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس سلسلہ میں مجھے کوئی مفصل معلومات حاصل ہوسکی ہیں تاہم ایک نامکمل سا خاکہ

جو مختلف ذرائع سے میں بنا پایا ہوں وہ کچھ اس طرح ہے کہ قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر (یو پی بھارت) نہ صرف فدا صاحب ہی کا مولد و مسکن تھا بلکہ اُن کے آباء و اجداد کی کئی نسلیں اسی قصبہ سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ گلاؤٹھی ہی کے ایک بزرگ حکیم سید امین الدین (پسر حکیم سید شہاب الدین مرحوم) سے جو شادباغ لاہور میں مقیم ہیں مجھے ایک قلمی رسالہ ملا جس کی فوٹو کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جو سید محمد حسینی واسطی ساکن گلاؤٹھی کا مرتب کردہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرتب کا شجرۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے رسالہ میں انہوں نے اپنی تاریخ ولادت ۱۲۲۳ھ تحریر کی ہے۔

رسالۂ مذکور کے حوالے سے یہ لکھنا ضروری ہے کہ جو حضرات اپنے نام کے ساتھ واسطی لکھتے ہیں ان کے لیے یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ان کے جدِ امجد حضرت ابوالفرح اپنے نام کے ساتھ لفظِ واسطی کا اضافہ اس لیے کرتے تھے کہ ان کا مولد و منشاء شہر واسط تھا جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان واقع ہے۔ مرتب نے رسالہ کو "تذکرۃ الاقرباء شجرۃ العلیاء" کا نام دیا ہے اس کے بعد وہ قصبہ گلاوٹھی کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قصبہ دہلی سے دو منزل مشرق میں واقع ہے۔ اس قصبہ کو ایک افغانی مسمی گلاب خاں نے جو صاحبِ اقتدار و ثروت تھا شیر شاہ یا سلیم شاہ کے عہدِ حکومت میں سن ۹۰۰ھ میں اپنے نام پر آباد کیا۔ بعد میں یہ نام "گلاب بسی" سے گلاؤٹھی ہوگیا۔ ساداتِ کرام کو یہ قصبہ جاگیر میں ملا اور انہوں نے یہاں سکونت اختیار کر لی۔ افغانوں کا اقتدار زوال پذیر ہوا تو اس کا نام سادات پور رکھا گیا۔

یوپی کا تمام خطہ ہی یوں تو مردم خیز تھا لیکن اس میں ضلع بلند شہر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے گلاؤٹھی بھی ضلع بلند شہر ہی کا اک قصبہ ہے جو ضلعی صدر مقام سے چودہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریائے گنگا اس کی مشرقی حدود اور دریائے جمنا اُس کی مغربی حدود متعین کرتے ہیں۔ محمود غزنوی ۱۰۱۸ھ میں برن (بلند شہر کا قدیم نام) کے

علاقہ میں پہنچا اور ۱۱۹۳ھ میں شہاب الدین غوری کا سپہ سالار قطب الدین "برن" پر حملہ آور ہوا۔ قاضی ضیاءالدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں ذکر کیا ہے کہ ۱۳۳۳ھ میں محمد شاہ تغلق نے بھی بلند شہر پر حملہ کیا۔

قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کا یہ تاریخی پس منظر فدا صاحب مرحوم کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اس لیے بھی ضروری ہے کہ عہد بہ عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی تغیرات جو اس خطہ میں رونما ہوئے وہ آخر کار ایک ایسے تہذیبی اور ثقافتی افق کی تشکیل پر منتج ہوئے جس کی رنگا رنگی فدا صاحب اور اس خطۂ ارضی میں شعر و ادب کے حوالے سے ابھرنے والی ہم عصر شخصیتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ فدا صاحب کی جو دو بیاضیں مجھے حاصل ہو سکی ہیں اُن کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا زیادہ تر وقت بہ سلسلۂ ملازمت مین پوری میں گذرا جو یو پی کے مشہور اضلاع میں سے ہے اور اس وقت ایک راجہ کے زیر حکمرانی بھی تھا۔ یہ ضلع یو پی کے وسطی علاقے میں شمالاً جنوباً فرخ آباد و آگرہ اور شرقاً غرباً اٹاوہ اور ایٹہ کے درمیان واقع ہے۔ بیشتر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی مسلمان صرف چار فیصد کے قریب تھے ان میں بھی بیشتر تعداد باہر بالخصوص لکھنؤ اور اس کے اطراف و اکناف سے آئے ہوئے مسلمانوں کی تھی۔ فدا صاحب کم و بیش پینتیس چالیس سال مین پوری میں رہے اور بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ آئے دن شعر و ادب کی محفلوں کے ہنگامے رہتے جن میں اس عہد کے مشاہیر شرکت کرتے تھے ان میں جگر مراد آبادی، عظیم آباد سے مرزا واجد حسین، یاس یگانہ، شوکت علی، فانی بدایونی جو اٹاوہ میں وکالت کرتے تھے۔ ٹونک کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن، فرخ آباد کے شاعر و صوفی حفیظ الرحمٰن مدیر ہفت روزہ مجیب، مدرسہ شفیق الاسلام فرخ آباد کے بانی و مہتمم مولانا غلام مصطفیٰ، بھوپال کے مشہور شاعر سہا احسن مارہروی، دلیر مارہروی، اصغر گونڈوی، سیماب اکبر آبادی، باغ سنبھلی، نوح ناروی، کیف کاسگنجوی، اور مضطر گلاؤٹھوی وغیرہ شامل تھے۔ شہر کی مشہور طوائف شیرازن سے جگر مراد آبادی کے مراسم اسی دور میں

بڑھے اور ان کی شاعری کو وہ رنگ ملا جس کی تمام برصغیر میں دھوم مچ گئی۔ بہرحال فدا صاحب کے دور میں ہی پوری کل ہند سطح کے مشاعروں کا مرکز بن گیا تھا اور ان کی شخصیت ان تمام سرگرمیوں کا محور رہی ۱۹۳۲ء میں ان کی زیر سرپرستی ایک ہفت روزہ "تسخیر" بھی جاری کیا گیا جو ان کے شاگرد قابل گلاؤٹھوی کی ادارت میں نکلتا رہا اور بعد میں کچھ عرصہ گلاؤٹھی سے بھی شائع ہوا۔

فدا صاحب کے دیوان میں اکثر غزلوں پر تاریخیں درج ہیں جن میں سب سے قدیم ایک فارسی منقبت ہے جو ۲۴ ستمبر ۱۸۹۲ء کو حضرت علیؓ کی شان میں کہی گئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

علیؑ مرتضیٰ نورِ خدا را طرفہ برہانے
بصورت مصطفیٰ شانے بہ سیرت شیر یزدانے

خدا خواہے خدا خوانے خدا ترسے خدا شانے
خدا گوئے خدا جوئے خدا بینے خدا دانے

بہ مُلکِ عشق سلطانے شعاعِ ماہ عرفانے
چراغِ خانۂ دین و فروغِ شمعِ ایمانے

انیسویں صدی عیسوی کے آخر کے کچھ اشعار قصائد کی شکل میں بھی ملتے ہیں جو حضرت شاہ صوفیؒ کی شان میں کہے گئے جن کا سالانہ عُرس فیروزآباد میں منعقد ہوتا تھا انہیں قصائد میں سے قصیدۂ اوّل سے چند اشعار درج ذیل ہیں جو مناظرہ کی طرز پر کہے گئے یہ مناظرہ بمقابلہ منشی جگن کشور جو حسن فیروزآبادی تخلص کرتے تھے ۸ دسمبر ۱۸۹۵ء کو منعقد ہوا :

سایہ افگن ہوا دل میں رُخِ زیبائے جمیل
آج روشن ہوئی کعبہ میں انوکھی قندیل

طبع مداح کو سُوجھی صفتِ روئے جمیل
یعنی والشمس کے ہاتھ آئی مقدس تاویل

شرم اِس بندۂ کمتر کی ہے بس آپ کے ہاتھ
نہ یہ زیرک ہے نہ ہشیار نہ دانا نہ عقیل

مختلف اشعارِ نظم و غزل پر تاریخیں درج ہونے سے فداؔ صاحب کے دورِ شاعری کے مختلف رجحانات، مجلسی زندگی کے آداب، ہم عصر شخصیتوں سے اُن کے روابط و مراسم اور نصف صدی سے بھی زیادہ مدّت پر محیط غیر منقسم ہند میں شعری رجحانات کے ارتقاء اور سماجی کیفیات کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اُن کی بیاض میں جو اشعار مقامات اور تاریخوں کے حوالے سے درج ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ فداؔ صاحب نے تقریبًا نصف صدی تک برصغیر کی اہم شعری نشستوں اور بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی جن میں اُن کے شاعرانہ مقام و مرتبہ کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا۔ دہلی میں پنڈت امرناتھ ساحرؔ کے یہاں جو محلہ بازار سیتا رام میں رہتے تھے، اکثر مشاعرے ہوتے جن میں فداؔ صاحب نے اپنے معاصرین کے ساتھ شرکت کی۔ گلاؤٹھی کے حوالے سے ایک بزرگ سیّد صفی اللہ کا نام اکثر دیکھنے میں آتا ہے جن کے یہاں شعری نشستیں منعقد ہوتی تھیں اور فداؔ صاحب اُن میں پورے ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے۔ علی گڑھ کے جوبلی مشاعروں میں فداؔ صاحب نے اکثر شرکت کی اور معرکۃ الآرا غزلیں پڑھیں۔ اِس کے علاوہ علی گڑھ اور مین پوری کی سالانہ نمائشوں میں جو مشاعرے ہوتے تھے، اُن میں بھی فداؔ صاحب شرکت کیا کرتے تھے۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو دہلی میں پنڈت امرناتھ ساحرؔ کی قیام گاہ پر جو طرحی مشاعرہ ہوا (مصرعۂ طرح: ایک دن یہ سازِ ہستی بے صدا ہو جائے گا) اُس میں پڑھی جانے والی فداؔ صاحب کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

شانہ اُنکی زلف کا عقدہ کُشا ہو جائے گا
اِس خوشی میں آج اک قیدی رہا ہو جائے گا

کیوں نہیں ہٹتی ہے آخر چشمِ دشمن سے نظر
آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا وعدہ وفا ہو جائے گا

کیا یہ سب دُنیا کی دُنیا آپ پہ مٹ جائے گی
کیا زمانے کا زمانہ مُبتلا ہو جائے گا

ریاضؔ خیرآبادی مرحوم (۱۸۵۳ء تا ۱۹۳۵ء) فداؔ صاحب کے ممتاز ہم عصروں میں سے تھے وہ امیرؔ مینائی کے شاگرد تھے جب کہ فداؔ صاحب کو داغؔ دہلوی کے شاگردوں میں ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ جیسا کہ داغؔ اور امیرؔ مینائی کے درمیان ہمیشہ چشمک رہی۔ اسی طرح اِن دونوں عظیم شعراء کے تلامذہ کے متوازی گروہوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ریاضؔ خیرآبادی مرحوم نے "فریاد" کی ردیف میں ایک غزل داغؔ دہلوی کے شاگردوں کی نسبت ایک چیلنج کے طور پر کہی اور فداؔ صاحب نے اس چیلنج کا بھرپور جواب دیا۔ جس سے ان کی قادرالکلامی اور عظیم فکری صلاحیتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس غزل کے مقطع میں انہوں نے اپنے استاد بھائی پروفیسر احسنؔ مارہروی سے دادِ سخن چاہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے وسط میں جو شعری معرکہ ہوا اُس کی گونج یقیناً پورے برصغیر میں سُنی گئی ہوگی۔ اس سلسلہ میں دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بے زبانوں کی سُنی جائے گی کیونکر فریاد
ضبط کس سے کرے اے داورِ محشر فریاد

جن کو فریاد کا دعویٰ ہو وہ سن لیں آ کر
یوں لکھا کرتے ہیں بے لاگ سخنور فریاد

یہ بالکل وہی انداز ہے جو ہمیں غالبؔ اور ذوقؔ کے دور میں بھی نظر آتا ہے اور

جو کلاسیکی دور کی خصوصیت ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

چنانچہ "شہزادہ جواں بخت" کا سہرا لکھنے کے سلسلہ میں غالبؔ اور ذوقؔ کے درمیان بھی معرکہ آرائی ہوئی جس کا غماز غالبؔ کا یہ شعر ہے ؎

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہدے کوئی اِس سہرے سے بڑھ کر سہرا

بہرحال فداؔ صاحب کی غزل سے جو "فریاد" کی ردیف میں کہی گئی مزید چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

حسرت و یاس و تمنا میں پڑی ہے ہلچل
کر رہا ہے دِلِ مظلوم کا گھر بھر فریاد

تو ہی اے پاسِ خموشی اِسے آ کر سمجھا
میرے قابو سے ہوئی جاتی ہے باہر فریاد

اٹھ گیا کون خفا ہو کے مرے پہلو سے
سوٹیں کرتی ہیں کس کی سرِ بستر فریاد

حضرتِ داغؔ کے شاگرد ہوں خاموش چہ خوش
پوربی یوں انہیں اترائیں سنا کر فریاد

قدر والے ہیں فداؔ بھائی دلیرؔ و احسنؔ
داد مارہرے سے دیں گے تری سنکر فریاد

علامہ اقبال مرحوم کو بھی داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل رہا گو کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا اور علامہ کی طبع رسا نے اپنی راہیں خود متعین کرلیں، تاہم اس نسبت سے کہ علامہ مرحوم داغؔ دہلوی سے رشتۂ تلمذ میں وابستہ رہے۔ فدا صاحب کو دوسرے استاد بھائیوں کی طرح علامہ مرحوم کا بھی احترام ہمیشہ ملحوظِ خاطر رہا اُن کی بیاض میں "جوابِ شکوہ" کے عنوان سے دو سو بائیس[۲۲۲] اشعار پر مشتمل ایک نظم (مسدس) درج ہے جو اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ فدا صاحب بھی برصغیر کے طول و عرض میں علامہ کی نظم "شکوہ" پر کی جانے والی تنقید سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکے۔ علامہ نے جب یہ نظم کہی تھی تو پورے ہندوستان میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کی طرف سے اُن کی اس "جسارت" پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ علامہ اقبال نے خود ہی "جوابِ شکوہ" لکھ کر اگرچہ لوگوں کا شکوہ دور کر دیا تھا لیکن اُن کی پہلی نظم اور دوسری نظم کے زور و اثر میں وہی فرق نظر آتا ہے جو ہم انگریزی شاعری میں ملٹن کی "پیرڈائز لاسٹ" (فردوسِ گم گشتہ) اور "پیرڈائز ری گینڈ" (فردوسِ بازیافتہ) کے درمیان محسوس کرتے ہیں، چنانچہ فدا صاحب کی مسدس بھی پہلی نظم ہونے کی حیثیت سے ایک شاہکار نظر آتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی نظم "شکوہ" کے ہر بند کے جواب میں ایک بند کہا گیا ہے بلکہ اکثر و بیشتر ردیف و قوافی بھی وہی استعمال کئے گئے ہیں مثلاً علامہ اقبال اپنی نظم کا آغاز یوں کرتے ہیں ؎

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں — فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں — ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

اور فدا صاحب کی نظم "جوابِ شکوہ" کا پہلا بند اس طرح ہے ؎

فکرِ فردا ہی رہے اور نہ غمِ دوش رہے — دل وہی دل ہے جو از خویش فراموش رہے

اک صدا کیلئے ہر دم ہمہ تن گوش رہے　　نغمۂ خاموش جو سننے ہیں تو خاموش رہے

قلبِ کج راہ یہ کیوں زعمِ سخن ہے تجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکت بدہن ہے تجھ کو

نظم سے مزید اقتباسات طوالت کے خوف سے پیش نہیں کیے جا سکتے تاہم صرف ایک بند پیش کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فدا صاحب کو علامہ اقبال کی نسبت پاس ہم عصری بھی ہے اور ان کی اللہ سے شکوہ سنجی پر افسوس بھی۔ کہتے ہیں ؎

بھائی اقبال مرے قوتِ بازوئے سخن　　رنگ ہی رنگ ہیں جن میں وہ ہیں شاداب چمن
خالی آداب کے پھولوں سے ہے اِنکا دامن　　اِنکی گستاخ اداؤں میں ہے بے ساختہ پن

سارے اللہ کے احسان فراموش ہوئے
وہ تو خاکم بدہن کہہ کے سبکدوش ہوئے

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا میری معلومات جناب فدا اور ان کے کلام کے بارے میں تقریباً صفر کے برابر تھیں۔ میری سب سے زیادہ کوشش یہ تھی کہ میں اُن کے عہد کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکوں چنانچہ قدرت نے میری مدد کی اور مجھے اپنے بڑے بھائی علامہ قابل گلاؤٹھوی کے کاغذوں میں فدا صاحب کی تاریخِ وفات مل گئی جو یکم مئی ۱۹۴۳ء ہے۔ اس تاریخ کے درست ہونے میں مجھے قطعی کوئی شبہ نہیں، اور اس تاریخ کی وساطت سے اُن کے سنِ ولادت کا تعین بھی اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ مصدقہ روایات کے مطابق فدا صاحب نے اسی برس کی عمر پائی تھی۔ اس طرح ان کا سالِ ولادت تقریباً ۱۸۶۳ء قرار پاتا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ فدا صاحب داغ دہلوی (۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۵ء) کے تلامذہ میں خاص مقام رکھتے تھے۔ داغ کے شاگردوں میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی اُن میں علامہ اقبالؒ کے علاوہ داغ کے داماد نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی، بیخود دہلوی، احسن مارہروی، بیخود بدایونی، نوح ناروی، وفا رامپوری، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، نسیم بھرتپوری،

جوش ملسیانی، اور آغا شاعر دہلوی وغیرہ شامل تھے۔ احسن مارہروی نے جو اعلیٰ پائے کے ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے اپنے استاد داغ دہلوی کی سوانح عمری "جلوۂ داغ" کے نام سے مرتب کی۔ سیماب صاحب نے جو آگرہ سے رسالہ "شاعر" نکالتے تھے ۱۹۳۶ء میں "داغ نورتن نمبر" کے زیرِ عنوان "شاعر" کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا جس میں فدا صاحب کو شامل کیا گیا تھا اور اُن کے انتخابِ کلام کے ساتھ ساتھ اُن کے فکر و فن پر ایک مبسوط مقالہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں انتہائی کوشش کے باوجود "شاعر" کا یہ خصوصی نمبر حاصل نہیں کر سکا ہوں ورنہ فدا صاحب کے بارے میں زیادہ مفصل اور مستند معلومات مہیا کر سکتا۔ قابل صاحب نے بھی اُن کی مختصر سوانح "حیاتِ جاوید" کے نام سے دہلی سے شائع کی تھی اور دہلی ہی کے ایک روزنامہ "وطن" کے سالنامہ ۱۹۳۷ء میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے۔ فدا صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ایک مقالہ شائع کیا تھا مگر ان دستاویزات میں سے کسی تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ بہرحال خود اُن کے کلام سے جو حوالے مل سکے ہیں وہی میرے اس تجزیئے کی بنیاد ہیں۔

ایک خاص بات جو شاگردانِ داغ اور خود فدا صاحب کے یہاں نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ اپنے استاد سے بے پناہ عقیدت و ارادت ہے جس کا اظہار جا بجا اشعار میں ملتا ہے۔ داغ کے تقریباً تمام ہی قابلِ ذکر تلامذہ اُن کی شوخیٔ طبع، لطیفہ سنجی، شیرینیٔ کلام، صوفیانہ و عاشقانہ مضامین کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام کی سادگی و سلاست کے حقیقی وارث و امین نظر آتے ہیں اور اپنے استاد کے خطابات مثلاً فصیح الملک، بلبلِ ہندوستان اور جہاں استاد وغیرہ کو اپنے کلام میں جگہ جگہ نظم کر کے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں فدا صاحب کے بھی اکثر اشعار اپنے استاد کی تعریف و توصیف کا مرقع ہیں۔ مثلاً ؎

کیوں نہ دیں داد فدا نغمہ سرایانِ سخن
بلبلِ ہند سے سیکھا ہے غزل خواں ہونا

فداؔ کیونکر نہ ہو حصّہ مرا جنّت فصاحت کی
کہ فردوس آشیاں ہے اک فصیحِ محترم مرا

چمن پر کیوں نہ چھا جائیں ترنم ریزیاں میری
دہن ہے بلبلِ ہندوستاں کا اور زباں میری

فداؔ ہوں بلبلِ ہندوستان کے نغمہ سنجوں میں
سجاتی ہیں مزارِ داغؔ کو گلریزیاں میری

اُوپر کے آخری دو شعر اُس آل انڈیا مشاعرہ کی یادگار ہیں جو ۱۹۳۸ء میں ہارڈنگ لائبریری دہلی میں علامہ اقبال کے انتقال کے بعد اُن کی یاد میں منعقد ہوا تھا یہ مشاعرہ غالباً حکیم الامت کے انتقال کے بعد اُن کی یاد میں منعقد ہونے والی پہلی بڑی تقریب تھی جس میں ہندوستان بھر کے معروف شعراء نے شرکت کی تھی۔ یہ مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوا تھا ایک خاص بات یہ تھی کہ مشاعرہ کئی نشستوں پر مشتمل تھا جن کی صدارت اُس وقت کے مختلف اساتذۂ شعر نے کی تھی چنانچہ ایک نشست کے صدر نشیں جناب فداؔ ہی تھے۔ مشاعرہ کا مصرعہ طرح علامہ اقبال کا یہ مصرعہ تھا ؎

چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

فداؔ صاحب نے مشاعرہ میں خود ایک غزل پڑھی اور سامعین کے اصرار پر اُن کا مزید طرحی کلام اُن کے چھوٹے صاحبزادے سید اقبال حسن نے ترنم سے پڑھا جو خود بھی ایک خوش فکر اور خوش الحان شاعر تھے اور قسیمؔ تخلص کرتے تھے۔ فداؔ صاحب کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دھواں بن کر اڑیں کیوں سوختہ سامانیاں میری
کھلے بالوں چلی ہے کس کے ماتم میں فغاں میری

کہانی مٹ چکی تھی بندگی کے ساتھ سجدوں کی
اُبھاری پھر کسی نقشِ قدم نے داستاں میری

چمن کی ہر کلی ہر گُل میری آرامِ منزل ہے
نہیں محدود تنکوں تک بہارِ آشیاں میری

فدآ یا رب تری دُنیا سے اب کیا لے کے جائے گا
کہ فردوسِ بریں نے چھین لی روحِ رواں میری

مقطع کے مصرعۂ ثانی میں فدآ صاحب کی چھوٹی بیٹی نوازی خاتون کی جواں سال موت کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ بہرحال اُن کے یہاں جو رنگِ کلام دیکھنے میں آتا ہے وہ اُن کے دیگر ہم عصروں اور بالخصوص شاگردانِ داغ کے کلام کی طرح یا تو فکرِ داغ کا ورثہ ہے یا داغ کے ممتاز ہم عصر امیر مینائیؔ (۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۱ء) کا فیضان۔ امیر مینائی کے ممتاز شاگردوں میں ریاض خیرآبادی، مضطر گلاؤٹھوی، اطہر ہاپوڑی، جلیل مانک پوری اور محسن کاکوروی بھی شامل تھے۔ ان شعراء کا سلسلۂ تلمذ امیر مینائی سے ہوتا ہوا اسیر اور پھر مصحفی سے ملتا ہے جب کہ داغ اور ان کے شاگردوں کا سلسلۂ تلمذ ذوق، شاہ نصیر، قائم چاندپوری، سودا اور شاہ حاتم سے ملتا ہے۔ شاہ حاتم کو دہلی کے مکتبِ شاعری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

شاہ نصیر کا اثر خاص طور پر جو ذوق کے استاد تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ داغ اور اُن کے شاگردوں میں نمایاں ہے۔ شاہ نصیر کو مشکل ردیف و قوافی میں اشعار کہنے سے خاص دلچسپی تھی جیسا کہ اُن کی ایک مشہور غزل کے درج ذیل مطلع اور مقطع سے ظاہر ہوتا ہے ؎

سدا ہے اس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نصیرؔ لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سُن کے جس کو
بندھے ہے یوں کب کسی بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

چنانچہ فداؔ صاحب کے یہاں بھی شاعرانہ کاوش کا یہ انداز اکثر و بیشتر نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک دلچسپ لیکن مشکل ردیف میں اُن کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جو اُن کی قادرالکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں ؎

اگر گریباں کی سیدھی چالیں سمجھ سکیں آستین و دامن
تو روٹھ کر خانۂ جنوں سے نکل چلیں آستین و دامن

جنابِ دستِ جنوں یہ کیا ہے کوئی بہار اپنی لُوٹتا ہے
تمہارے اُجڑے ہوئے چمن میں کہاں رہیں آستین و دامن

جو پیراہن تنگ ہے جنوں کا جو اس سے دل تنگ ہے جنوں کا
یہ اپنی دُنیا کہاں بسائیں کہاں لبسیں آستین و دامن

شعر گوئی میں مشکل پسندی کا یہ رجحان آج کے دور میں اگرچہ تقریباً ناپید ہے لیکن اردو شاعری کی تاریخِ ارتقاء کا جائزہ لیتے وقت اسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا در اصل یہ رجحان ایک مخصوص معاشی اور معاشرتی پس منظر کو بھی سامنے لاتا ہے جس میں لوگوں کی زندگیوں میں آج جیسی تگ و دو نظر نہیں آتی بلکہ معاشی آسودگی یا مکمل قناعت کا ایک ہمہ گیر احساس کارفرما نظر آتا ہے یہی ماحول تھا جس نے اردو شاعری کو پروان چڑھایا اور دنیا میں کسی بھی زبان کی شاعری کے مقابلے میں بامِ عروج پہ لا کھڑا کیا۔ اس ضمن میں ریاستوں، امراء کے درباروں اور

رؤسا کے ایوانوں میں جو محفلیں سجائی گئیں ان سے شعر و ادب میں بہت سی قدآور شخصیتیں اُبھریں اور برِصغیر کے نامساعد سیاسی حالات کے دور میں بھی اردو شاعری کی شمع فروزاں رہی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر (جسے جنگِ آزادی کہا جانا چاہیئے) کے بعد اکثر شعراء نے رامپور اور حیدرآباد (دکن) کا رُخ کیا ان میں سب سے ممتاز داغ اور امیر مینائی تھے۔ داغ دہلوی جن کا تعلق نواب لوہارو کے خاندان سے تھا ایک عرصہ تک دربارِ رامپور سے وابستہ رہے اور آخر عمر حیدرآباد میں گذاری، بہرحال اِس تناظر میں فدا صاحب یا اُن کے معاصرین میں مشکل پسندی کا جو رجحان نظر آتا ہے وہ ایک مخصوص سماجی و معاشی پس منظر کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان حضرات کی مہارتِ فن، تبحرِ علمی، شاعرانہ مشاقی اور قادرالکلامی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ فدا صاحب کی بیاض میں "نقشِ پا" کی ردیف میں کئی مسلسل غزلیں ملتی ہیں جو کم و بیش یک صد اشعار پر مشتمل ہیں اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے شاہکار ہیں، ان غزلوں سے جو مختلف قوافی میں کہی گئی ہیں چند اشعار بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں ؎

آسماں تک ہم کو ملتا ہے سُراغِ نقشِ پا
کیوں نہ ہو عرشِ معلیٰ پہ دماغِ نقشِ پا

خاک بر سر یوں نہ ہوتا گر مزارِ نقشِ پا
پاؤں کے چھالے نہ بنتے سوگوارِ نقشِ پا

تنگ ہے پامالیوں سے سخت جانِ نقشِ پا
اپنے تلوں پہ نہ کھلواؤ زبانِ نقشِ پا

خاکساری پہ کھُلا جُرم حجابِ نقشِ پا
نقشِ پیشانی بنا فوراً نقابِ نقشِ پا

پائے بوسی پر جو کُھلتا ہے دہانِ نقشِ پا
تیغِ صرصر کاٹ دیتی ہے زبانِ نقشِ پا

اس ضمن میں کچھ ایسے اشعار بھی ملاحظہ کیجئے جو شاعر کی عظمتِ فن اور شعور و آگہی کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

شہرہ مرے کلام کا ہر انجمن میں ہے
طوطی وہ بولتا ہوا میرے چمن میں ہے

ہر بات میں مزہ ہے حلاوت سخن میں ہے
گویا تری زبان ہمارے دہن میں ہے

محسن سے لوگ آج پئے داد آئے ہیں
لطفِ کلامِ داغ ہمارے سخن میں ہے

آخری شعر میں محسن کاکوروی کی طرف اشارہ ہے جو امیر مینائی کے شاگرد تھے

کچھ اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

کون سر کرتا ہے دیکھیں آج میدانِ سخن
کیسے کیسے چلتی ہے شمشیرِ بُرّانِ سخن

میرے پنجے سے کوئی مضمون نکلے تو سہی
ہاتھ جودت کا ہے میری اور دامانِ سخن

یہ کیا پیراہنِ وحشت کی امیدِ حزیں نکلی
چلا دامن کا دامن آستیں کی آستیں نکلی

کچھ ایسی شوخیوں سے میری آہ آتشیں نکلی
ترے فتنوں کی بھی پیروں کے نیچے سے زمیں نکلی

معمہ جانتے تھے ہم شکن کو اُن کے ماتھے کی
مقدر سے ہماری ہی وہ تحریرِ جبیں نکلی

جنوں میں بھی مرے دستِ طلب کی دیکھئے قسمت
کہ پیراہن کا جو ٹکڑا ترا شا آستیں نکلی

تری نوکِ سناں دل سے جگر میں کیسے جا پہنچی
بطِ نے تھی مگر ظالم کہیں ڈوبی کہیں نکلی

غلط فہمی سے جس کو اہلِ عالم چرخ کہتے تھے
تماشا ہے کہ وہ قاتل کے کوچہ کی زمیں نکلی

زباں داں ہی فقط سمجھے تھے ہم تو اے فداؔ تجھ کو
تری طبعِ رواں تو خوب مضمون آفریں نکلی

فداؔ صاحب کا عہدِ شاعری اور بھی بہت سی ممتاز شخصیتوں سے مزین نظر آتا ہے اور لگتا یوں ہے کہ معاصرین کے اس قافلے نے جیسے ایک ہی مقام سے سفر کا آغاز کیا ہو اور منزل پر پہنچنے کی لگن میں جو درمیانی فاصلے نمایاں ہوئے ہیں وہ اپنی اپنی کاوشوں اور شوق کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ قافلہ جن شخصیتوں پر مشتمل ہے اُن میں شادؔ عظیم آبادی، اصغرؔ گونڈوی، آرزوؔ لکھنوی، حسرتؔ موہانی، فانیؔ بدایونی، جلیلؔ مانک پوری، یاس یگانہؔ چنگیزی، ناطقؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی آسیؔ الدنی اور پنڈت برجموہن دتا دریہ کیفی جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ فداؔ صاحب نے اپنی چھوٹی بیٹی سیدہ نوازی خاتون کی شادی کے موقع پر ۲۶ دسمبر ۱۹۲۴ء کو گلاؤٹھی میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کرائی تھی اُن کے جن معاصرین نے اِس میں شرکت کی اُن میں سائلؔ دہلوی، بیخودؔ دہلوی، نوحؔ ناروی، فانیؔ بدایونی، جگرؔ مرادآبادی، ندرتؔ میرٹھی احسن مارہروی، بیخودؔ موہانی اور گلاؤٹھی کے شعراء میں سید امیر حسن امیرؔ گلاؤٹھوی اور سید

مشتاق علی مضطرؔ قابلِ ذکر ہیں۔ نوح ناروی کے دیوان "سفینۂ نوح" میں گلاؤٹھی کے اس طرحی مشاعرہ کا ذکر ہے جس کا مصرعہ طرح تھا ؎

موتیوں سے بھر دیا شبنم نے دامانِ بہار

فداؔ صاحب کے کلام سے مزید کچھ اقتباس یا انتخاب پیش کرنے سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ غزل اگرچہ اُن کا خاص میدان تھا اور اس میدان میں اُن کی طبع رسا نے بڑے بڑے جوہر دکھائے لیکن دوسری اصنافِ سخن مثلاً رباعی، قصیدہ، مثنوی، حمد، نعت، سلام اور منقبت وغیرہ میں بھی اُن کی استادی مسلّم ہے۔ چنانچہ ان کی غزلیات کے ساتھ ساتھ وہ نظمیں جو انہوں نے مخمس یا مُسدّس کی شکل میں کہی ہیں اپنی روانی، اثر آفرینی اور زبان و کلام کے محاسن کے اعتبار سے اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ قرار دی جا سکتی ہیں۔

فداؔ صاحب کی فکر کی بنیاد واضح طور پر تصوّف ہے اُن کے کلام میں عشقِ رسولؐ کی والہانہ پرچھائیاں نظر آتی ہیں لیکن مجموعی طور پر اُن کی شاعری کا مزاج اور آہنگ غزل کا لوچ، شیرینی اور ایمائیت لیے ہوئے ہے اپنی فکر کے اظہار کے لیے وہ مختلف کیفیات کو تشخص عطا کر کے اپنے کلام میں اثر پذیری کو اور بھی دوچند کر دیتے ہیں وہ کس طرح اپنی متصوفانہ فکر اور مذہبی سوچ کو شاعری کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی کیا جا سکتا ہے ؎

دل سے نکلے تو وہ قربانِ نبیؐ ہو جائے
میری امید بھی مکّی مدنی ہو جائے

اِک دہن سے رہے دنیائے محبّت آباد
میری ہر سانس اویس قرنی ہو جائے

آج وہ جلوہ گہہ سرِ تجلّی ہوں میں
راز جس پر مرا کھُل جائے ولی ہو جائے

نعمتیں اتنی ملیں تیرے فداؔ کو یا رب
وردِ ہر سانس کا اللہ غنی ہو جائے

نغمۂ صوتِ سرمدی سازِ خیال میں بھی آ
خلوتِ قال سے نکل جلوتِ حال میں بھی آ

زخمِ دروں ہے منتظر اپنی نمودِ حسن کا
ابروئے روئے لم یزل شانِ ہلال میں بھی آ

اے دُرِ بحرِ ابتدا مایۂ نازِ انتہا
بن کے کسی کی آرزو قلبِ مثال میں بھی آ

ہجر کا دن سیاہ ہے وصل کی دُور راہ ہے
عشقِ اویس کے قمر برخِ بلال میں بھی آ

پردہ میں کیوں چھپی رہیں نکتہ نوازیاں تری
حسنِ وجود کی نمود زینتِ خال میں بھی آ

مست مئے وصال کی پیاس ابھی بجھی نہیں
بادۂ ساغرِ ازل جامِ سوال میں بھی آ

دید میں اب نہ دیر ہو برقِ نظر کی خیر ہو
گوہرِ تاجِ کُن فکاں تابِ جمال میں بھی آ

اب تو دوپہر ڈھل گئی ہستی ہماری جل گئی
اپنے کمال کا طفیل وقتِ زوال میں بھی آ

اے رُخِ جلوۂ فنا میں ہوں اور آئینہ ترا
بن کے جلالتِ فداؔ صورتِ حال میں بھی آ

پتے پتے کو غرورِ رُخِ زیبائی ہے
کس کا منہ دیکھ کے گلشن میں بہار آئی ہے

لاکھ پھولوں میں بسے جب نہ ہوا کوئی حجاب
میری آنکھوں میں سمانا بڑی رسوائی ہے

خود ہی گستاخ بنایا ہے تو شکوہ کیسا
مفت آئینہ پہ الزامِ خود آرائی ہے

تصوّف کے میدان میں اُن کی فکرِ رسا نے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں اور شعر میں نہایت سلاست و سادگی سے حیات و کائنات۔ خالق و مخلوق اور ہمہ اوست و ہمہ از اوست کے دقیق فلسفے اس طرح بیان کیے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ فلسفیانہ فکر کو حُسنِ کلام کا سانچہ اس طرح عطا کیا ہے کہ اُن کی غزل کہیں بھی بوجھل نظر نہیں آتی بلکہ ایک دلپذیر لطافت اور اچھوتا پن اُن کے فن کی نمایاں خصوصیات بن کر سامنے آتی ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

مرے یقیں میں نہیں یا مرے گماں میں نہیں
ترا جمالِ دل افروز کس مکاں میں نہیں

تلاشِ ہستیٔ آوارہ سے خدا حافظ
کہیں ٹھکانہ ترا عمرِ رائیگاں میں نہیں

بھٹکتی پھرتی ہے یارب کہاں فغانِ جرس
سراغ اُس کا کہیں شورِ کارواں میں نہیں

تجلّیات کو اسے خلوتی نہ کر محدود
وہ ہر مکان میں ہے کونسے مکاں میں نہیں

تعین کی کشاکش میں زمیں یا آسماں کیوں ہو
تم ہی تم ہو تو تفریقِ مکان و لامکاں کیوں ہو
ہمارا ہوشِ رفتہ بے نشانی کا نشاں کیوں ہو
ترے ذکرِ خفی کی بے خودی بھی رازداں کیوں ہو
مرے انفاسِ آوارہ کو جو ڈھونڈے نہیں ملتا
مری روحِ درواں کا اُس چمن میں آشیاں کیوں ہو

شوقِ نظّارہ بھی مستِ مئے عرفاں ہو جائے
تو جو پردے سے حقیقت کے نمایاں ہو جائے
چشمِ دل روئے تو پیمانۂ طوفاں ہو جائے
ہنس پڑیں آپ تو دنیا چمنستاں ہو جائے

یہ پوچھتا ہوا بیہوش ہو گیا ہوں میں
خبر ہوں اپنی الٰہی کہ مبتدا ہوں میں
تلاشِ حسنِ سماعت میں کھو گیا ہوں میں
کسے سناؤں کہ کس ساز کی صدا ہوں میں
مرا خمار ہے نیرنگِ دورِ بزمِ شہود
کہ بیخودوں میں بھی اک رندِ پارسا ہوں میں
الجھ رہا ہے خضر سے کسی کا نقشِ قدم
اسے بھی ہے یہی دعویٰ کہ رہنما ہوں میں

یہی مآلِ فنا ہے یہی کمالِ فنا
کہ اُن کی آنکھوں سے اب اُن کو دیکھتا ہوں میں

وہ میری شکل میں آکر بڑے غرور کے ساتھ
مجھی سے پوچھ رہے ہیں بتا کہ کیا ہوں میں

جو طے کروں تو لیں اک سانس میں ہے بیڑا پار
خود اپنی منزلِ مقصد کا فاصلہ ہوں میں

ہٹا جو پردہ خودی کا تو دیکھتا کیا ہوں
کہ جھانکتا ہے کوئی خواب گاہِ غفلت میں

نہیں ہیں حشر سے غافل مسافرانِ عدم
تھکن اتار رہے ہیں غریبِ تُربت میں

ترے کرم کے وہ موتی جو تھے کبھی آنسو
چمک رہے ہیں مرے دامنِ ندامت میں

تصوّف کی جھلکیاں فدؔا صاحب کے فارسی کلام میں خاص طور پر نمایاں بلکہ بقول غالبؔ لگتا یوں ہے کہ "فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ" اور یہی نہیں بلکہ بعض اساتذہ کی زمینوں میں جن میں حافظؔ، سعدیؔ، خسروؔ شامل ہیں نہایت خوبصورت غزلیں کہیں ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ فدؔا صاحب کی متغزلانہ فکر فارسی میں ایک کہکشاں بن کر مطلعٔ سخن پر نمودار ہوتی ہے تراکیب کا در و بست، تشبیہ و استعارہ کا حسن اور لفظ و صوت کی نغمگی اُن کی شاعرانہ عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ امیر خسروؔ کی مشہور زمین "شب جائے کہ من بودم" میں ایک نہایت خوبصورت غزل کہی ہے جسے خسروؔ جیسے استادِ سخن کی نسبت ایک جسارت کہتے

کی بجائے اُن کی مہارت سے تعبیر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ چند شعر پیشِ خدمت ہیں ؎

بجانم طرفہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم
بہ دستش دامنِ دل بود شب جائیکہ من بودم
تپیدن را دلِ عشاق کرد آرائشِ محفل
بہارِ رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم
گہے دلبر بہ دل بود و گہے دل بود در دلبر
بیک جا دلبر و دل بود شب جائیکہ من بودم
جمالِ یار دیدم در فروغِ داغِ بیتابی
دلم خود شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم
چہ گویم بیکسی دیا کہ گویم رنجِ تنہائی
من و بیچارۂ دل بود شب جائیکہ من بودم
فدا را رہنمائے بود عزقِ خود بپائے اُو
جبینم خضرِ منزل بود شب جائیکہ من بودم

بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ چاہے فارسی میں فکرِ سخن کریں یا اردو میں، رباعی لکھیں یا قصیدہ یا کوئی اور صنفِ سخن تغزل ہی اُن کی فکر کی اساس ہے اور سلاست اُن کا اسلوب ہی نہیں بلکہ محاورہ و روزمرہ کا استعمال اُن کے یہاں اس قدر بے ساختہ و بے تکلفانہ ہے کہ زبان و بیان پر اُن کی دسترس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے وہ خود بھی اپنے کمالِ فن کا ایک واضح شعور رکھتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اے فدا تھا یہ فقط پاسِ زبانِ اردو
ورنہ دشوار بھی کہنا مجھے دشوار نہ تھا

روایت کے وہ قائل ہی نہیں بلکہ اُس کا احترام اُن کا شعار ہے اُن کے کلام میں تجربہ و مشاہدہ بھی دونوں شانہ بشانہ نظر آتے ہیں ایک اور فارسی غزل اور اردو کی ایک غزل سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:-

دوش دیدیم بہ میخانہ نگارے عجبے
چشم مستے عجبے بود و خمارے عجبے

نہ کمیں گاہ نہ دامے نہ کمانے نہ خدنگ
می رود شوخیٔ چشمش بہ شکارے عجبے

ہمچو آئینہ ز رویش متحیّر ماندم
یافتم از رخِ دلدار قرارے عجبے

نہ کسے فاتحہ خوانے نہ کسے نوحہ گرے
ساختم بر درِ سفاک مزارے عجبے

جلوہ فرما بہ دلِ ماست زہے طالع ما
ماہ روئے عجبے مہر نگارے عجبے

من نہ دانم کہ کدامی رود و می آید
یافتم در دلِ خود راہ گذارے عجبے

جملہ در سینۂ من سوختنی ہاست فدا
می فروزم بہ تمنائے شرارے عجبے

اتنا نہ سر چڑھایئے زلفِ سیاہ کو
رسوا نہ کیجئے مرے حالِ تباہ کو

کیجئے نہ تنگ گوشۂ زلفِ سیاہ کو
رستہ تو دیجئے دلِ گم کردہ راہ کو

شرکت میں آنسوؤں کی خریدیں ندامتیں
رحمت کے مول بیچ رہا ہوں گناہ کو

اُن بجلیوں کو ڈھونڈھ رہی ہے نگاہِ شوق
چمکا کے چھُپ گئیں جو تری جلوہ گاہ کو

پروان چڑھ رہی ہیں مری بیگناہیاں
توبہ نے جب سے گود لیا ہے گناہ کو

میری نگاہِ شوق تو جلوؤں نے چھین لی
آنکھیں کہاں سے لاؤں تری لغزشِ راہ کو

داغ کے شاگرد کی حیثیت سے فدا صاحب زبان کی سادگی، سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ شوخی اور معاملہ بندی کے بھی قائل نظر آتے ہیں اِن خوبیوں نے اُن کے کلام کو انسانی جذبات واحساسات کے حوالے سے آفاقیت سے ہمکنار کر دیا ہے اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں انہوں نے مشکل قوافی اور ردیف کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے وہاں زبان وبیاں کے پیرایہ کو نہایت شگفتہ اور دلپذیر بنایا ہے۔ وہ استعارے اور تشبیہات کے استعمال میں خاص مہارت رکھتے ہیں اور اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں کہ زبان کا توازن کہیں بگڑنے نہ پائے۔ داغ کے مخصوص رنگ میں کلام کے چند نمونے ہے

دل یہ کہتا ہے کہ آپ ان کو نہیں جانتے ہیں
وہ بڑے وہ ہیں انہیں کچھ ہمیں پہچانتے ہیں

زخم تو زخم جگر کا نہیں سینہ میں پتہ
مانتے ہیں تجھے اے تیر ادا مانتے ہیں

ہے وہ کھوئی ہوئی کیا چیز کہ ملتی ہی نہیں
خاک کیوں آج ترے خاک نشیں چھانتے ہیں

آفریں ہے تجھے اے اُن کی کمانِ ابرو
تیر میری طرف آتا ہے جدھر تانتے ہیں

زُہد کیا ہے ترے اُترے ہوئے ناوک کا شکار
اچھے اچھے تجھے اے اُن کی ادا مانتے ہیں

ایسی ناوک فگنی ہے کہ نہ دل ہے نہ جگر
نہ کماں ہاتھ میں لیتے ہیں نہ کچھ تانتے ہیں

منہ سے تاہم نہیں کہتے کہ ہے تصویرِ فدا
مسکراتے ہوئے منہ پھیر کے پہچانتے ہیں

تلوّن چھوڑ دو تم اپنی حالت ایک سی کر لو
کہ جس سے دوستی کی ہے اُسی سے دشمنی کر لو

ملو تم غیر سے دل کھول کر اچھا یہی کر لو
تمہاری میں خوشی کرتا ہوں تم اُس کی خوشی کر لو

اگر روٹھے ہو تو اچھی طرح اپنی خوشی کر لو
جدھر منہ پھیرے بیٹھے ہو اُدھر ہی پیٹھ بھی کر لو

تبسّم کا بہانا ہے یہ دشمن کو ہنسانا ہے
ہمارے زخمِ دل کی خیر تم کر لو ہنسی کر لو

نہیں جب دوستی ہم سے تو کیوں ہو دشمنی ہم سے
تمہارا دوست دشمن ہے اسی سے دشمنی کر لو

نہیں یہ آئے دن ہم دھمکیاں کب تک جفاؤں کی
جو کل کرتے اُسے تم آج ہی کر لو ابھی کر لو

تمہیں چھیڑیں گے ہنس ہنس کر تمہارے اوچھے واروں پر
دلِ مجروح لیتے ہو تو اُس کے زخم سی کر لو

فدا آجاتا رہا اب لطف مضموں آفرینی کا
تکلف چھوڑ دو اب سیدھی سادھی شاعری کر لو

کیوں خفا ہو تم سے اپنا مدّعا کس نے کہا
بے محابا بے محل بے ساختہ کس نے کہا

خود ہی چھیڑا پیشِ دشمن خود ہی برہم ہو گئے
منصفی سے آپ ہی کہیئے کہ کیا کس نے کہا

میرے اُن کے تخلیے میں ہو گیا جو کچھ ہوا
اے نگاہِ شرم تجھ سے سچ بتا کس نے کہا

نام سے اب چاہنے والوں کے نفرت ہو گئی
یاد تو کیجئے ذرا ہم کو فدا کس نے کہا

یوں تو پھرتی ہے ہمیشہ چھانتی گلیوں کی خاک
اُن کی بُو لے کر کبھی بادِ صبا آتی نہیں

جان دیتا ہے بتوں پر اے دل کافر پرست
شرم کچھ بھی تجھ کو اے مردِ خدا آتی نہیں
یوں تو ہر اہلِ ادا کے واسطے حاضر ہے جاں
ایسے دلیوں پر مگر طبعِ فدا آتی نہیں

وہی دشمن کا پہلو تم نے پھر مدِّ نظر رکھا
نہ مانے پھر نہ مانے پھر اُسی زانو پہ سر رکھا
نہ صحرا میں رکھا صحرا نہ گھر میں ہائے گھر رکھا
کسی گھر کا نہ تو نے ہم کو اے سودائے سر رکھا
شبِ ہجراں کی ہلچل میں بتا اے جسمِ زار آخر
دلِ بیتاب کس پہلو میں تو نے رات بھر رکھا
وہیں وہ پا گئے ہم کو جہاں ہم مٹ گئے اُن پر
وہیں وہ چھا گئے ہم نے جہاں گھبرا کے سر رکھا
دلِ پُر داغ نے کی رہنمائی راہِ الفت میں
چراغ اچھا یہ تم نے درمیانِ رہگذر رکھا
یہ ترتیبِ ستمگاری نئی ہے میرے سینے میں
اُٹھا کر دردِ دل بیدرد نے دردِ جگر رکھا
چمن میں شبنمِ گریاں کو رونا ہے تو اِس کا ہے
کہ آنسو پونچھنے کو اُس کے دامانِ سحر رکھا

کب غیر کے زانو پہ ترا سر نہیں ہوتا
کمبخت ہمارا یہ مقدر نہیں ہوتا

ہے فرق تو اتنا ہے بس آئینہ میں تم میں
یہ دیکھنے والوں سے مکدر نہیں ہوتا

مطلب کے لیے چھیڑ رہا ہوں شبِ وعدہ
ویسے تو کوئی جامہ سے باہر نہیں ہوتا

کیا یہ بھی کوئی پردہ نشینی کی ادا ہے
چہرہ ترا آئینہ سے باہر نہیں ہوتا

رکھتے ہیں فدا آ دہ جو کبھی دستِ تسلی
پھر آپے میں اپنا دِل مضطر نہیں ہوتا

فدا صاحب کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بزرگانِ دین اور اولیائے کرام سے خاص ارادت وعقیدت رکھتے ہیں اِس سلسلہ میں اُن کی اکثر نظمیں جو منقبت اور سلام کی شکل میں ہیں اُن کے والہانہ جذبات کی آئینہ دار ہیں اِس سلسلہ میں ایک طویل فارسی نظم (مسدّس) اُن کے دیوان میں درج ہے جو حضرت سلطان المشائخ حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں کہی گئی ہے۔ نظم جہاں محاسن کلام کا ایک مرقع ہے وہاں احترام وعقیدت کے اظہار کا ایک والہانہ نمونہ بھی۔ صرف دو بند پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے کلام کے تیور پہچانے جا سکتے ہیں ؎

اے عروسِ خلوتِ نازِ جمالِ کُن فکاں — وے ادائے دیدۂ لمعاتِ حسنِ بے نشاں
مایۂ نازِ تجمل جلوۂ حسنِ نہاں — مُہرِ فرمانِ محبت شمعِ بزمِ عاشقاں

در دلِ عشاق زخمِ بے نشاں انداختی
شورِ حُسنِ خود بہ بازارِ فغاں انداختی

خالِ رویت آبروئے نکتہ سنجانِ شہود　　طُرہ طرازِ زلفت سنبلستانِ شہود
در نگاہت شورشِ قلبِ نمکدانِ شہود　　در خرامت راحتِ آشفتہ حالانِ شہود
در حریمِ عاشقی محبوب ذات لم یزل
آسمانِ نیرِ تابندۂ حُسنِ ازل

حضرت خواجہ غریب نوازاجمیریؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری کے دوران جو مسدس کہی گئی
وہ بھی فدآصاحب کی عقیدت وارادت کی آئینہ دار ہے ذیل کے بند ملاحظہ ہوں ؎

تپشِ دل اِسی سرکار پہ قربان ہوجائے　　اشک جو آنکھ سے ٹپکے دُرِ غلطاں ہوجائے
چشمِ نظارہ مری دیدۂ ایماں ہوجائے　　آنکھ کافر بھی ڈالوں تو مسلماں ہوجائے
جس زمیں پر مرا سجدہ ہو فلک ہوجائے
سانس سے میرے جہنم بھی خنک ہوجائے

فخر ہے مجھ کو کہ خاکِ درِ سرکار ہوں میں　　دولتِ عجز پہ قبضہ ہے وہ نادار ہوں میں
الفتِ گیسوئے خواجہ کا سیہ کار ہوں میں　　چشمِ بد دُور فدآئے جگر افگار ہوں میں
غنچے میرے ہیں صبا میری ہے گلشن میرا
پھول میرے ہیں مہک میری ہے دامن میرا

ہے جو سجدوں کی دھنی میں وہ جبیں لایا ہوں　　پائے اقدس کو سرِ خاک نشیں لایا ہوں

کچھ نہیں لایا ہوں میں کچھ بھی نہیں لایا ہوں　　　ہاں مگر نذر کو اک قلبِ حزیں لایا ہوں

بھول ہو جائے جو سرکار کا دامن مل جائے
بُلبلِ شوقِ نظر کو یہی گلشن مل جائے

فدا صاحب کا کلام اُن کی فکر اور رجحانات و میلانات کو سمجھنے کے لیے گہرے مطالعہ کا طالب ہے وہ بظاہر ایک روایت پسند شاعر ہیں لیکن مذہب و تصوّف کے حوالے سے اُن کے نظریات انہیں ایک راسخ العقیدہ مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ حُبِّ رسول کے مظاہر اُن کے جملہ کلام کا احاطہ کرتے ہیں وہ ایک خاص سلیقہ سے اور نہایت ادب و احترام سے اپنے جذباتِ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں بزرگانِ دین کی شان میں جو نظمیں کہی گئی ہیں اصل میں انہیں بھی بنیاد اُن کے جذبۂ حُبِّ رسولؐ نے فراہم کی ہے مشکل ہی سے اُن کی کوئی غزل ایسی ہو گی جس میں نعتیہ شعر نہ ہوں جب کہ اُن کی کہی ہوئی نعتیں اُن کی داخلی وارفتگی کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ مثلاً

وہ دیکھو جھُوم کے بادل اُٹھا مدینہ سے
چلی کرم کی وہی پھر ہوا مدینہ سے

مبارک ابرِ کرم کو درود کا سہرا
عروس بن کے سدھاری ہوا مدینہ سے

شفاعتوں کے جلو میں بڑے جلوس کے ساتھ
معاف ہو کے چلی ہے خطا مدینہ سے

الٰہی میرا دِل بیقرار بن جائے
چمک کے برقِ تبسّم نما مدینہ سے

ٹپکا رہی ہے پسینہ جبینِ قربت کا
ہوائے دامنِ آلِ عبا مدینے سے

بے ہوش ہے سوزِ غمِ ہجرانِ محمدؐ
فریاد ہے اسے جنبشِ دامانِ محمدؐ

خورشیدِ لحد ہے مجھے خورشیدِ قیامت
سوتا ہوں تہہِ سایۂ دامانِ محمدؐ

فارسی میں بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

نسیمے بہ بوئے حجاز آمدہ
کہ زلفش بہ افشائے راز آمدہ

طوافِ رُخِ پاک گیسو نمود
بلائے بہ شوقِ نماز آمدہ

حجابِ تعین زدل دُور باش
کہ ہنگام رازونیاز آمدہ

کرم ہائے برقلبِ زارم فزود
غمش نیز بندہ نواز آمدہ

فدا ہم بہ دربارِ شاہی رسید
بدرگاہِ محمود ایاز آمدہ

فدا صاحب کے یہاں بعض اصنافِ سخن کا استعمال اُن کے تبحرِ علمی کی بھی غمازی کرتا ہے۔ اِس سلسلہ میں انہوں نے بہت سی تاریخیں بھی کہی ہیں جو اپنی برجستگی اور معنویت کے اعتبار سے اُن کے عالمانہ مرتبہ کا پتہ دیتی ہیں۔ یہاں بھی اُن کی تاریخ گوئی سے ایک ایسی مثال دینا چاہوں گا جس میں اُن کے ذاتی جذبات بھی شامل ہیں۔ یہ تاریخ اُن کے نواسہ سید مختار عالم

شاغل کی ولادت سے متعلق ہے جو اُن کی چھوٹی بیٹی نوازی خاتون کے پہلے فرزند ہیں۔ قطعۂ تاریخ میں فدا صاحب کی اُس محبت کا بھی بے محابا اظہار ہوتا ہے جو انہیں اپنے داماد اور شاگرد قابل صاحب سے بھی رہا ملاحظہ ہو ؎

گُل نو کی نمو سے چشم بد دُور
بڑھا یہ اقتدارِ باغ قابل

چمن میں انگلیاں غنچوں کی اُٹھیں
وہ آیا گلعذار باغِ قابل

فدا اچھی لکھی تاریخِ مولود
بحمد اللہ "بہار باغِ قابل"
۱۳۴۴ھ

بیٹی نوازی خاتون کی تاریخِ وفات جن کا اُنتقال ۱۱ر جولائی ۱۹۳۸ء کو ہوا یوں کہی ؎

۲۳۹
زقائم ازل آمد ندائے
بااسمِ ذات واصل شد نوازی
۱۹۳۸ء = ۱۶۹۹ + ۱۳۹

اسی ضمن میں اُن کی ایک رباعی اور ایک قطعہ بھی ملاحظہ ہو ؎

کثرت کی نمود بے مثالی تیری
وحدت کا شہود خوش جمالی تیری
تیری تصویر بے تعین کی قسم
ہے میرا کمال بے زوالی تیری

گردِ راہِ سفرِ ملکِ حجازی ہوں میں
بندۂ بے درہم بندہ نوازی ہوں میں
یہی عزّت یہی دولت یہی شوکت ہے فداؔ
یہی معراج ہے میری کہ نیازی ہوں میں

مزید کچھ متفرق اشعار پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فداؔ صاحب کے تجربات اور مشاہدات جب شعر کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو سہل ممتنع کی کیفیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اُن کی شعر گوئی اُن کی فن کارانہ مہارت کی بھی آئینہ دار ہے وہ الفاظ و تراکیب کا اہتمام ایک مخصوص تکنیک کے تحت کرتے ہیں اور اس طرح جذبوں اور داخلی کیفیات کی بے پناہی کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کا فارسی اور اُردو کلام ان کی فصیح و بلیغ فکر کا آئینہ دار ہے، اُن کی شعر گوئی اُن کے عہد کے حوالے سے ایک خوش سلیقگی کا شاہکار دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

احساسِ قرب بھی نہ رہا کس کی بیخودی
میں ہوں کہاں پکار رہے ہو کہاں مجھے

بن کر سرور ولطف رہوں چشمِ ناز میں
اتنا لطیف کر نگۂ ناتواں مجھے

بابِ قبول پر کہیں رسوائیاں نہ ہوں
خاموش لے چلا ہے فریبِ فغاں مجھے

مجھ تک آتے ہی مرے دل کی طرح ٹوٹ گیا
ساغرِ مے بھی تو آیا تیرا پیماں ہو کر

میری وحشت مجھے دیتی ہے دلاسے کیا کیا
میرے بازو پہ تری زلف پریشاں ہوکر
قیس کی وحشتِ دل کو جو ٹھکانہ نہ ملا
رہ گئی روشنئ چشمِ غزالاں ہوکر
ہم ہیں ہر وقت فدا محوِ تماشائے جمال
نہ کہ آئینہ کہ تکتا رہے حیراں ہوکر

خموشیاں ہیں تکلم مرے بیاں کے لئے
سکوت شرح بیاں ہے مری زباں کے لئے
گلوں کو سے کے درختوں پہ چڑھ گئیں بیلیں
چلے کشیدہ جو وہ سیرِ بوستاں کے لئے

تیز کچھ اور مری آتش پنہاں ہو جائے
کچھ کرم اس پہ بھی اے جنبش داماں ہو جائے
پرزے تیرے بھی اُڑیں دامنِ امیدِ عدو
تو بھی اللہ کرے میرا گریباں ہو جائے

شعاعِ حسن سے دل جگمگا دیئے کس نے
جو سو رہے تھے وہ فتنے جگا دیئے کس نے
جو اک نگاہِ تغافل سے ہو گئے پامال
وہ حسن و عشق کے قصے سنا دیئے کس نے

مجھی پہ کر کے ہمیشہ جفا و جور کی مشق
مجھے وفا کے سلیقے سکھا دیئے کس نے

حسن کو ساقیٔ میخانہ بنایا ہوتا
عشق کو لغزشِ مستانہ بنایا ہوتا
پھول بھی اُن کے تبسم کو دعائیں دیتے
برگِ گُل کو لبِ پیما نہ بنایا ہوتا
میں چمن میں بھی نہ ہوتا کبھی ممنونِ بہار
بجلیوں میں مرا کاشانہ بنایا ہوتا
قیس تنہا ہی رہا رونقِ بازارِ جنوں
کچھ تو لیلیٰ کو بھی دیوانہ بنایا ہوتا

دیدۂ وادیٔ ایمن کا تماشا ہوں میں
سو چمن جس سے ہیں آباد وہ صحرا ہوں میں
خود بخود جو نظر آئے وہ تماشا ہوں میں
آپ ہی آپ جو جم جائے وہ نقشہ ہوں میں
تازہ ہو ہو کے مجھے پھول دعا دیتے ہیں
بارشِ ابرِ لطافت کا وہ چھینٹا ہوں میں
ایک جلوے سے مرے دیر و حرم ہیں آباد
شانِ کعبہ ہوں کبھی جانِ کلیسا ہوں میں

میری تربت میں میرے ساتھ ہیں لاکھوں جلوے
بیکسی تجھ کو یہ دھوکا ہے کہ تنہا ہوں میں

دورِ ادراک سے باہر ہے مری فہم محیط
عقل کو جس کی تمنا ہے وہ سودا ہوں میں

تحت میں ہے مری رفعت کے عروجِ ملکوت
یہ بھی تحقیر ہے میری کہ فرشتہ ہوں میں

ذائقہ لطف اٹھائے نہ مزے سے میرے
باصرہ دیکھ نہ پائے وہ تماشا ہوں میں

سامعہ سن نہیں سکتی میری سرگوشی کو
لامسہ چھو نہیں سکتی وہ اچھوتا ہوں میں

شامہ بوئے دل آویز سے میری محروم
واہمہ جس سے ہے ششدر وہ ہیولا ہوں میں

وہ مسافر ہوں کہ ہر دل میں ہے منزل میری
اپنے گھر بیٹھے ہوئے بادیہ پیما ہوں میں

ہے مرے حسنِ دل افروز سے دنیا آباد
اور کہنے کو فدا خاک کا پتلا ہوں میں

یہ نئی ہوئی رقابت یہ عجیب ماجرا ہے
جسے ڈھونڈتی ہیں آنکھیں اُسے دل بھی ڈھونڈتا ہے

جو ٹھکانے تک نہ جائے جو پھرے تو پھر نہ پائے
وہ تھکا ہوا مسافر مری آہِ نارسا ہے

ابھی جایئے نہ دل سے کہ ہے بھیڑ حسرتوں کی
ابھی اور بیٹھ لیجئے ابھی راستہ رُکا ہے

نہ نشاں نہ کچھ نشانی نہ حروف ہیں نہ معنی
تری منزلِ فنا میں یہ مقام کونسا ہے

نہ کسی کا نام اس میں نہ انہیں سلام اِس میں
یہ خطِ جبیں الٰہی مرا کس نے لکھدیا ہے

اسے آپ بھُول بیٹھے کسے آپ بھُول بیٹھے
اسے کہتے ہیں نیازی وہی آپ کا فدا ہے

خندۂ شیشۂ مے کا نہیں مطلب کھلتا
کیوں ٹپکتا ہے تبسم مرے پیمانہ سے

نامہ بر دوڑ کے زلفوں کی بلائیں لینا
تجھ سے پوچھے جو مرا حالِ پریشاں کوئی

کبھی ہے رُخ کی کبھی گیسوؤں کی بات بڑی
کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

بڑے سرور بڑے لطف سے گزاری رات
خبر نہیں وہ ہماری تھی یا تمہاری رات

دُعا دے اے شمیمِ گل نسیمِ صُبح کے دم کو
کہ یہ غنچوں کے قیدی صبح کو آزاد کرتی ہے

بُلبلِ نغمہ سرا پھُول بچھے جاتے ہیں
کس دبے پاؤں کی آہٹ تری آواز میں ہے

چھڑ گئی بادِ صبا کی کسی مستانے سے
بے پروں کاگ اڑے جاتے ہیں میخانے سے

کیا اعتبار ہے نفسِ بے ثبات کا
راہیں چھٹی ہوئی ہیں ہوا کے سوار کی

تم اپنی چال سے کہہ دو کہ سیدھی راہ چلے
الجھ پڑے نہ زمانے کا انقلاب کہیں

ہمارے سجدۂ طاعت کو بخشدے یا رب
وہ شے جو خاک میں مل کر بھی سرفراز رہے

ترے ذکر پر شاخِ گل جھوم اُٹھی
ترا نام آیا تو گردن جھُکا دی

بسنتی قبا سے لبھانے چلے ہیں ہتھیلی پہ سرسوں جمانے چلے ہیں
وہی وہ نظر آ رہے ہیں جو مجھ میں تو اب کس کی ہستی مٹانے چلے ہیں

یہ نیاز و ناز کا فیصلہ ہوا اک خموش پیام سے
نہ ملیں گے منظرِ عام پر نہ ہٹیں گے منظرِ عام سے

حیرتِ آئینہ کو یوں ہے کہ تمہیں دیکھا ہے
تم کسے دیکھ کے رہ جاتے ہو حیراں ہو کر

خوب مانگا آئینہ سے روئے انور کا جواب
اب برابر کی ہیں چوٹیں اب برابر کا جواب
توبہ توبہ ابرِ گریاں اور مرے اشکِ رواں
روتی صورت کیا بنے گی دیدۂ تر کا جواب

فدا صاحب کی اولاد اور تلامذہ کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اولاد میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور تلامذہ کے ضمن میں اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں سے استفادہ کرنے والے بے شمار۔ بیٹوں کے نام علی الترتیب سید نواب حسن شمیم، سید ابنِ حسن، سید شبیر حسن، سید عزیز حسن اور سید اقبال حسن قسیم۔ سید نواب حسن شمیم کا انتقال تقسیم برصغیر کے بعد ہاپوڑ ضلع میرٹھ (بھارت) میں ہوا۔ وہ ایک خوش فکر شاعر تھے اور محکمہ زراعت کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے سید اقبال حسن قسیم جو خوش فکر و خوش الحان شاعر تھے بتیس[۳۲] سال کی عمر میں جوانی ہی میں گلاؤٹھی میں تقسیم سے بہت پہلے انتقال کر گئے تھے۔ منجھلے بیٹے سید ابنِ حسن کا انتقال پاکستان آنے کے بعد

۱۹۶۰ء میں لاہور میں ہوا۔ سید شبیر حسن مرحوم جو حسن نیازی کے قلمی نام سے لکھتے تھے ایک بلند پایہ انشاء پرداز تھے اور دہلی میں اُن کا بیشتر وقت خواجہ حسن نظامی مرحوم کی رفاقت میں گذرا۔ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد لاہور میں شاہ عالمی دروازہ میں رہائش اختیار کی اور وہیں سے فدا صاحب مرحوم کی یاد میں ایک ماہنامہ "فدائی" جاری کیا لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے جہاں ان کا انتقال ہوا سید عزیز حسن مرحوم پاکستان بننے کے دو تین سال بعد ہجرت کرکے لاہور آئے اس زمانے میں میں کالج میں زیر تعلیم تھا کچھ دنوں میرے پاس قیام کیا اور پھر کراچی چلے گئے جہاں وہ کچھ عرصہ علیل رہے اور آخری وقت بہاولپور آ گئے اور وہیں انتقال کیا۔ میری والدہ مرحومہ سیدہ تلمیذ فاطمہ فدا صاحب کی بڑی بیٹی تھیں ان کا انتقال راولپنڈی میں ۲۸ر فروری ۱۹۶۵ء کو ہوا اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا چھوٹی بیٹی نوازی خاتون پہلے ہی اپنے وطن گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں انتقال کر چکی تھیں۔

ایک اور شخصیت جنہیں فدا صاحب کی شفقت و محبّت کے حوالے سے اُن کی اولاد کے زُمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے اور شاگرد رشید بھی قرار دیا جا سکتا ہے وہ تھے ظفر نیازی مرحوم جو فدا صاحب کے بھانجے تھے اور جنہوں نے انہیں کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ظفر نیازی صاحب بھی ایک بلند پایہ ادیب و انشا پرداز تھے اور برّصغیر میں انہوں نے اپنی زندگی ہی میں شہرت حاصل کر لی تھی انہیں بھی دلّی میں خواجہ حسن نظامی مرحوم سے بڑی قربت حاصل رہی لہٰذا سلاست و روانی کی خوبیوں کے حوالے سے اُن کے یہاں خواجہ صاحب کا اثر و فیضان نمایاں ہے دہلی سے انہوں نے ایک ماہانہ رسالہ "کامیاب" جاری کیا تھا جسے وہ تقسیم ملک تک نہایت کامیابی سے نکالتے رہے پاکستان آنے کے بعد کراچی سے ماہنامہ نقاد جاری کیا جس نے نہ صرف ملک میں اور ملک سے باہر شہرت حاصل کی بلکہ پاکستان کی صحافتی زندگی میں ایک ہلچل مچا دی۔ ظفر نیازی صاحب کو جن کا انتقال کراچی میں ہوا اپنے اسلوبِ نگارش کے لیے ادب و صحافت دونوں شعبوں میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

فدا صاحب کے تلامذہ کے بارے میں میری معلومات بہت محدود ہیں۔ قابل گلاؤٹھوی اُن کے شاگرد ہی نہیں بلکہ جانشین بھی ٹھہرائے گئے تھے اور فدا صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اُن

کی ذہانت وقابلیت کے پیش نظر اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاحِ سخن کی اجازت دے دی تھی۔ قابلؔ صاحب پُرگو بھی تھے اور زود گو بھی انہوں نے بلامبالغہ ایک لاکھ سے متجاوز اشعار کہے ہوں گے اُن کے آخری برسوں کا کہا ہوا کچھ کلام میرے پاس محفوظ ہے جسے میں ترتیب دے رہا ہوں اور خدا کرے جلد اس کی اشاعت کی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو سکوں۔ فداؔ صاحب کے ایک اور ممتاز شاگرد جناب شمس ہاپوڑی بھی پاکستان آ گئے تھے اُن کا انتقال ملتان میں ہوا۔ فداؔ صاحب کے دیوان میں "خیال" کی صنف میں جو اشعار ملتے ہیں اُن میں اکثر پر شمس ہاپوڑی کی فرمائش کا حوالہ درج ہے۔ جناب رفیق عزیزی بھی فداؔ صاحب کے باصلاحیت تلامذہ میں سے ہیں جو پاکستان آنے کے بعد سے آج تک شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ رفیق عزیزی صاحب نے ادبی صحافت میں بڑا نام پیدا کیا اور ایک عرصے تک لاہور سے ایک ادبی مُجلّے کی ادارت کرتے رہے آج کل کراچی میں تصنیف و تالیف سے متعلق ایک مقتدر ادارہ کے سربراہ ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ وہ چند نام جو شاگردانِ فداؔ کے ضمن میں مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہو سکے ہیں اور جن میں ہندو مسلم شعراء شامل ہیں یہ ہیں:۔

حکیم محبوب علی اختر فیروزآبادی، طفیل احمد ہلال الٰہ آبادی، وقار ڈبائیوی، نثار اکبرآبادی، بزم اکبرآبادی وحشی کانپوری، وفا فرخ آبادی، شفق ہاپوڑی، شوق مرادآبادی، اصغر حسین اصغر بہاری، جیون صادق، تربینی سرن شاد اور لاڈلی لال لائق وغیرہ۔

ضمیمہ

پروفیسر ڈاکٹر سبط حسن فاضل زیدی
ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل۔پی۔ایچ۔ڈی
شعبۂ اردو۔ایس۔ایم گورنمنٹ سائنس کالج کراچی

فدا بحیثیت شخص و شاعر[۱]

عبدالوحید نام، فدا تخلص، قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے ایک ممتاز حسنی الواسطی خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ والد بزرگوار مولوی سید حیات اللہ شاہ نقشبندیہ و قادریہ سلسلہ کے ایک برگزیدہ صاحب طریقیت بزرگ تھے جن کا انتقال بعالم تحصیلداری ضلع فتح پور ہسوہ میں ہوا۔

فدا صاحب گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے۔ مولانا احسن مارہروی نے ان کا سن ولادت ۱۲۷۸ھ لکھا ہے[۲] ابتدائی تعلیم مدرسۃ العلوم گلاؤٹھی میں حاصل کی۔ ان کے استاد عربی مولانا شاہ عبداللہ داماد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) اور فارسی کے استاد مولانا صوفی سید محمد حسنؒ تھے جو سلسلہ نقشبندیہ کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے۔ زمانۂ شباب میں مولوی امام بخش صہبائیؒ کے شاگرد سید محمد حسین یقینؔ سے فارسی اور عربی میں استفادہ کیا۔ ان کا ملازمت کا زمانہ اپریل ۱۸۹۴ء میں ضلع مین پوری میں شروع ہوا اور مارچ ۱۹۲۵ء میں وہیں ختم ہو گیا بعدازاں پنشن لے کر گوشہ نشین ہو گئے۔

---

[۱] ڈاکٹر فاضل زیدی کے داغؔ دہلوی سے متعلق پی۔ ایچ ڈی کے مقالے سے ماخوذ (منصور عاقل)۔

[۲] مقالہ "مرزا داغ اور ان کے نورتن" از احسن مارہروی (سالنامہ شاعر ۱۹۳۷ء)۔

شاعری کا شوق عنفوانِ شباب ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اپنا کلام مولوی سید کفایت علی علویؔ ہاپوڑی کو دکھاتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت داغؔ دہلوی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا اور ان کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے عموماً بذریعہ خط و کتابت اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے اور یہ سلسلہ جب تک داغؔ زندہ رہے قائم رہا۔

نوحؔ ناروی نے ان کو داغؔ کے ممتاز تلامذہ میں شمار کیا ہے[1] اور مولانا احسن مارہروی نے ان کا شمار داغؔ کے نورتنوں میں کیا ہے۔ مولانا احسن اپنے مقالہ مرزا داغؔ اور ان کے نورتن " میں لکھتے ہیں:۔

" جناب فداؔ ایک روشن دماغ، جواں قلب بزرگ ہیں۔ جن لوگوں کو موصوف کی صحبت میں دو گھنٹے رہنے کا بھی فخر نصیب ہوا ہے انہیں یہ رائے قائم کرنا پڑی ہے کہ آپ کے منہ سے نکلا ہوا لفظ لفظ حرف حرف اپنے اندر قسم قسم کی شعریتیں لئے ہوئے سامعین و حاضرین کے قلوب پر جانفزا اور کیف انگیز نقوش قائم کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ آپ کے اشعار کے مطالعہ سے آپ کی زندگی کے مختلف دور پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ ابتداً آپ کے کلام میں داغؔ کی سادگی، شوخی اور معاملہ بندی کا عنصر غالب تھا اس کے بعد رفعتِ تخیل و بلندیٔ فکر نے سابقہ معیار کو ارفع بنا کر اشعار میں وہ بندشِ الفاظ نمایاں کر دی جسے دیکھنے والا غالبؔ و مومنؔ کو یاد کرنے لگتا ہے۔"

آخر عمر میں سلوک و تصوف کی طرف رجحان بڑھ گیا تھا۔ جن کے اثرات ان کے آخری دور کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان کو نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ سلسلوں میں متعدد بزرگانِ طریقت سے بیعت و خلافت حاصل تھی۔ ۱۹۵۳ء[2] تک بقید حیات تھے۔ بعد کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کا کوئی مجموعۂ کلام چھپ کر شائع نہیں ہوا۔

---

[1] مقالہ فصیح الملک داغؔ دہلوی از نوحؔ ناروی (نگار لکھنو داغؔ نمبر)

[2] یہ تاریخ درست نہیں۔ فداؔ صاحب کا انتقال یکم مئی ۱۹۰۲ء کو گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں ہو گیا تھا۔ (منصور عاقل)

انتخابِ کلام

رہے پابند کیوں قیدِ مکانی میں نشاں تیرا
ترا ہر شے میں گھر ہے ہر مکاں ہے لامکاں تیرا

ترے سجدہ کو کس دل میں جگہ دوں خوف ہے یارب
جبینِ معصیت منہ پر نہ لے آئے نشاں تیرا

ہمارا دیدۂ بینا ہے پردہ حسنِ پنہاں کا
ہماری ہستیٔ موہوم ہے رازِ نہاں تیرا

جہاں ہم مٹ گئے تیرا وہیں نقشِ قدم پایا
جہاں سر رکھ دیا ہم نے وہیں ہے آستاں تیرا

بہت شرما لجا کر تیری رحمت کے بھروسے پر
فدائے منفصل آیا ہے بن کر حمد خواں تیرا

بڑا اپہنچا ہوا ہے حمد میں ربطِ رقم میرا
کہ میری سانس کے رستے پہ چلتا ہے قلم میرا

نہ ہو کیوں حمد میں گل ریز اعجازِ رقم میرا
کہ شاخ تازہ بن کر پھوٹ نکلا ہے قلم میرا

میرے سجدے فضائے لامکاں میں ہیں تو کیوں پوچھوں
کہ وہ محدود کعبہ کا خدا ہے یا صنم میرا۔

درودیں پڑھ کے کھلتی ہیں میرے انفاس کی کلیاں
قسم کھا کر چلا ہے کس تبسم کی قلم میرا۔

مجھے کیا خود مری جاتی ہوئی دنیا کو حیرت ہے
کہ کیوں پکڑا گیا اکھڑی ہوئی سانسوں میں دم میرا

خطِ تقدیرِ دشمن بن رہا ہے کوئے جاناں میں
یہاں بھی سر برآوردہ رہا نقشِ قدم میرا

خدا کیونکر نہ ہو حصہ مرا جنت فصاحت کی
کہ فردوس آشیاں ہے اک فصیح محترم میرا

سادگی میں ہے عجب عالم تیری تصویر کا
گویا نقشہ کھنچ گیا قرآن کی تفسیر کا

پتہ پتہ ہے فروغ حسن پنہاں کا نقاب
ذرہ ذرہ آئینہ ہے آپ کی تصویر کا

ہر دہانِ زخم دل میں جل رہا ہے اک چراغ
نام روشن ہو رہا ہے عاشقِ دلگیر کا

کچھ میرے ہمدردِ وحشت جیب و دامن ہی نہیں
ہے گریباں چاک ہر حلقہ مری زنجیر کا
میری دستارِ فضیلت عاجزی ہے اے فدا
خاکساری میری خلعت ہے میری توقیر کا

نہیں دشوار کسی کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مگر چاہیئے انساں ہونا
عقلِ کُل کا ہے عطیہ مرا انساں ہونا
ناخنوں میں میری مشکل کا ہے آساں ہونا
نہ نکل تیغ جفا میاں سے باہر نہ نکل
پردے والوں کے لئے ننگ ہے عریاں ہونا
بخش دے حشر سے پہلے اسے اے داورِ حشر
اپنے قاتل کا نہ دیکھوں میں پشیماں ہونا
میرے غمخانہ کی تقدیر میں گردش نے لکھا
گھر کا گھر اور بیاباں کا بیاباں ہونا
تجھ پہ بھی پھول لٹائیں گی چمن میں کلیاں
زخمِ دل تو بھی کسی کا لبِ خنداں ہونا
تجھ میں ہے قدر وفا اے خمِ گیسو ان کے
تو سکھا دے انہیں شرمندۂ احساں ہونا

آدمی آدمی ہوتا ہے بڑی مشکل سے
ایسے ولیسوں کا اجارہ نہیں انساں ہونا

کیوں نہ دیں داد فدا نغمہ سرایان سخن
بلبل ہند سے سیکھا ہے غزل خواں ہونا

جگر بھی دل کی طرح تیر کا نشانہ تھا
یہ ظلم بھی میرے ظالم کا منصفانہ تھا

ملالِ ہجر ترے زلف کی کہانی تھی
خیالِ وصل ترے حسن کا فسانہ تھا

یہ کیا کہ آئے نہ تنہا مری عیادت کو
اجل بھی آتی ہی رہتی تمہیں تو آنا تھا

نہ رہتے وہ میرے دل میں تو پھر کہاں رہتے
یہی ٹھکانہ تھا ان کا یہی ٹھکانہ تھا

وُہی ہو تم کہ تمہیں بات تک نہ آتی تھی
وہی ہیں ہم کہ ہمارا بھی اک زمانہ تھا

غرور حسن پہ نقش جبیں تڑپ اٹھے
الٰہی کس کا یہ دَر کس کا آستانہ تھا

قیامت خیز ہوتا اور بھی جور آفریں ہوتا
اگر کمبخت گردوں ان کے کوچہ کی زمیں ہوتا

نہ روتی اپنی حالت پر کبھی تردامنی میری
یہ میرا اشکِ آوارہ اگر دامن نشیں ہوتا

دمِ آخر اگر آنے سے وہ انکار کر دیتے
کشاکش میں نہ دامان نگاہ واپسیں ہوتا

مجھے رونا تو اس کا ہے کہ ان کا بن گیا ظالم
مرا دل میرا کہلاتا کہیں جاتا کہیں ہوتا

فدا میری اداسی کا اگر کچھ بھید کھل جاتا
تو پھر ہر ذرہ اس کوچہ کا اک قلب حزیں ہوتا

ہار پہنا میری آہوں نے مبارک باد کا
آسماں پر بول بالا ہے مری فریاد کا

بھولنے والے کو قاصد بھی الوکھا مل گیا
ہچکیاں پیغام لائی ہیں کسی کی یاد کا

سرو کی بھی اے نسیم صبح خاطر ہے ضرور
نام لیوا ہے چمن میں یہ بھی اک آزاد کا

دیکھ اے پاس نزاکت حد بھی کوئی ضبط کی
چھوڑ دے اب چھوڑ دے دامن مری فریاد کا

اٹھتے اٹھتے پیشوائی کو وہ آ پہنچے فدا
لو مقدر جاگ اٹھا ہے پھر دل ناشاد کا

شانہ ان کی زلف کا عقدہ کشا ہو جائے گا
اس خوشی میں آج اک قیدی رہا ہو جائے گا

کیا یہ سب دنیا کی دنیا آپ پر مٹ جائے گی
کیا زمانہ کا زمانہ مبتلا ہو جائے گا

خضر کے ممنون کیوں ہوں آپ کے گم کردہ راہ
آپ کا نقش قدم ہی رہنما ہو جائے گا

بے محل اچھی نہیں ہے چھیڑ اے شوق بقا
مجھ سے آزردہ میرا ذوق فنا ہو جائے گا

آج تک تو دل ہمارا آئینہ ہے آپ کا
آپ کا دل پھر ہمارا آئینہ ہو جائے گا

حشر تک ارمان رہیں گے سب کے سب محو جمال
حسرتوں کا گھر کا گھر ہی پارسا ہو جائے گا

مل گیا تاج غلامی بادشاہوں کا فدا
اور اب کیا چاہتا ہے اور کیا ہو جائے گا

بے پروں اڑتا ہے ہر ذرّہ بیابانوں کا
ہے جلوس آج ہوا پر تیرے دیوانوں کا

تو ہی کہہ دے تجھے پیمان شکستہ کی قسم
کس کو میرا سا یقین ہے تیرے پیمانوں کا

بڑھ کے آئینہ دکھایا جو وفاؤں نے مری
منہ ذرا سا نکل آیا تیرے احسانوں کا

آبلوں میں بھی نہ کچھ سوز دروں نے چھوڑا
گھر کا گھر پھونک دیا سوختہ سامانوں کا

لذت زخم نہیں حد سے گزرنا اچھا
ذائقہ تلخ نہ ہو جائے نمک دانوں کا

ماہ نو خرچ پہ کس کا ہے ہلالی تمغہ
اور کس کا ہے تیرے چاک گریبانوں کا

قابل فخر فدا یوں ہے فصاحت میری
نام لیوا ہوں میں اردو کے زباں دانوں کا

اٹھ گیا دیدۂ مشتاق سے پردا تیرا
نظر آتا ہے تماشا ہی تماشا تیرا

تجھ میں ہے میری ادا مجھ میں کرشما تیرا
تو تماشا ہے مرا میں ہوں تماشا تیرا
پار ہوتے ہیں تو ہستی سے گزرنے والے
ڈوبنے والوں کو پایاب ہے دریا تیرا
ہے ہر اک زخم دروں تیری ادا کا سکہ
اور ہر سینہ پر داغ خزانہ تیرا
کہیں مجنوں کی صدائیں کہیں لیلیٰ کی پکار
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے صحرا تیرا

سجا ہے پھولوں سے میرا مزار کیا کہنا
خزاں رسیدہ چمن کی بہار کیا کہنا
تمام پھولوں پہ رنگیں کہانیاں لکھ دیں
تیرے قلم کا فسانہ نگار کیا کہنا
کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی
پلٹ دیئے میرے لیل و نہار کیا کہنا
مجھی میں چھپ کے مجھے درشنوں کو ترسایا
ترے نثار مرے پردہ دار کیا کہنا
ہے چوکٹے میں عناصر کی بولتی تصویر
مری شبیہ کے آئینہ دار کیا کہنا

توبہ کے بعد بھی وہی جوشِ سرور تھا
بخشی ہوئی خطا کا یہ پہلا قصور تھا

بجلی چڑھا رہی تھی تبسم کی چادریں
کیا چرخ پہ مزار دلِ ناصبور تھا

اتنا حجاب ہے تو تعارف کا کیا سوال
وہ مجھ سے جتنے پاس ہیں ہیں اتنی دور تھا

آرام تھا تو سایۂ مژگان غیر کو
کانٹوں پہ لوٹنے کو دلِ ناصبور تھا

میری شبِ فراق کہاں اور سحر کہاں
یہ کہیئے ہاں کہ آپ کے جلووں کا نور تھا

اے عندلیب اس پہ عبث بجلیاں گریں
کیا تیرا پھول میرا دلِ ناصبور تھا

داغِ قمر اُسی کی ہے دھندلی سی یادگار
ماتھے پہ چرخ کے جو نشانِ غرور تھا

فنا کے باغ میں جب موسمِ بہار آیا
ہوا کے گھوڑے پہ ہر ایک گل سوار آیا

چمک رہے ہو تمہیں تم منورِ ہستی میں
میری فنا کا تمہیں اب تو اعتبار آیا

نگاہِ شوخ کی کیا خوب پیشوائی کی
مرا قرار بھی کمبخت بے قرار آیا

یہ کیا ملا تیری فرقت میں یہ تو کچھ نہ ملا
کہ ہاتھ آیا تو دامان انتظار آیا

نگاہ ناز سے بھی شوکت جفا نہ گئی
سمند ظلم پہ تیر ادا سوار آیا

نفس کو ہستی موہوم کا پتہ نہ ملا
ہزار بار گیا اور ہزار بار آیا

جھکا دیا سر رفعت ہوائے خجلت نے
چراغ بھی تیری تربت پہ شرمسار آیا

جیئے تو صورت ہستی کو ہم مٹا کے جیئے
مرے تو ہم کو پیام وصال یار آیا

اس سے پہلے جبکہ میں آب و گل آدم میں تھا
اور ہی عالم تھا میرا اور ہی عالم میں تھا

کچھ نہ ہوتے تو فرشتے مانتے سب کچھ ہمیں
کچھ تو تھے ہم روز اول کچھ تو آخر ہم میں تھا

کر دیا نور سحر کی نذر شوق دید نے
رات بھر کا جو تماشہ دیدۂ شبنم میں تھا

کیوں قیامت کا قیامت تک کرایا انتظار
جبکہ سب کچھ اک ادائے درہم و برہم میں تھا

انتظار عشق میں، ہیں کیوں یہ زلف آرائیاں
کیا مرا خواب پریشان خاطر برہم میں تھا

اے فدا اک اضطراب تلب تھا جسکی کلید
وہ خزانہ اک نظر کی شوخیٔ پیہم میں تھا

نہاں اسی میں اگر حسن بے نشاں ہوتا
تو تلب زار بھی چھوٹا سا اک مکاں ہوتا
ہمارے ساتھ تمنائیں بھی فنا ہوتیں
یہ قافلہ بھی اسی راہ سے رواں ہوتا
تعینات میں کیوں ڈھونڈتی مجھے ہستی
مرا وجود بھی گم کردۂ نغاں ہوتا
یہ کیا کیا کہ ھزار آئینے بنا ڈالے
اسی نگاہ میں سب کچھ یہ این وآں ہوتا
ملائکہ پہ جو کھلتا مرا عروج نیاز
وقار سجدہ فرشتوں کا آسماں ہوتا
سبق ملا جو فدا کو فنائے ہستی کا
اسی بیاض میں مضمون بے بیاں ہوتا

نغمے ہمارے سن کر ہر پھول جھومتا ہے
بھرتی ہے دم چمن میں باد صبا ہمارا
اقبال ہے ہماری ہر چھائیوں کا عاشق
سایہ اڑا رہا ہے اب تک ہما ہمارا

اے بادِ صبح چل کر کانٹوں کو بھی بتا دے
آخر گلِ تمنا کیوں کر کھلا ہمارا

لے لیا ہاتھ میں دل اپنے تماشائی کا
بڑھ گیا ہاتھوں کلیجہ مری رسوائی کا

ایک ہی پھول کی نکہت کا یہ صدقہ ہے کہ آج
پتہ پتہ کو ہے دعویٰ چمن آرائی کا

کشتۂ عشق تے شاید اسے مایوس کیا
چہرہ اترا نظر آتا ہے مسیحائی کا

تجھ پہ قربان تیری جلوہ نمائی کے نثار
آئینہ مجھ کو بنایا ہے خود آرائی کا

وہ فدا ہوں میں کہ پردہ میں مری صورت کے
ڈھونڈتا ہے مجھے جلوہ تیری یکتائی کا

کسی کا حسن بے پردہ کسی پر چھا گیا ہوتا
کوئی آئینہ ہوتا کوئی آئینہ نما ہوتا

خیال زلف میں کیوں کالے کوسوں منزلیں ہوتیں
کسی تنہا مسافر کا جو سیدھا راستہ ہوتا

نہ ہوتا خار کا کھٹکا جو گل میں تجھ کو اے بلبل
تو یہ رنگ دوئی تیرا کبھی کا اڑ گیا ہوتا

مزا آتا محبت میں جو یہ کایا پلٹ ہوتی
جدھر وہ دیکھتے ان کی نگاہوں میں فدا ہوتا

آئینہ بے خودی کا جو پیش نظر ہوا
ان کی خبر کے واسطے میں بے خبر ہوا
نالوں کو آہ سرد تھپک کر سلا گئی
پنکھا مرے نفس کا نسیم سحر ہوا
اللہ رے محو دید کی بیدار بختیاں
کہتی ہے شام اٹھیے کہ وقت سحر ہوا
گھبرا کے درد دل نے پکارا جو ہجر میں
حاضر ہزار دل سے فدا کا جگر ہوا

جلوہ ہوتا مرے دل میں جو نمایاں تیرا
پاؤں پھیلا کے نہ سوتا غم پنہاں تیرا
سوز پنہاں کی مرے آگ بجھی جاتی ہے
اب سہارا ہے تو اک جنبش داماں تیرا
تیرا ہمدم کوئی دل ہے نہ تمنا کوئی
آج کیا حال ہے اے زلف پریشاں تیرا
زخم دل زخم جگر دونوں ہیں روشن اس سے
دو گھروں کا ہے اجالا غم پنہاں تیرا
رحمت حق نہ بھرے پھول تو میرا ذمہ
حوصلہ بھی ہو کچھ اے دامن عصیاں تیرا
چشم بد دور وہ آئے ہیں فدا کے دل میں
چھن گیا آج ٹھکانہ غم ہجراں تیرا

آئینہ کی بے محل ترکیب حیرت دیکھنا
کس کی صورت دیکھتا ہے اس کی صورت دیکھنا

شوخیوں میں اور اگر کچھ چاہتے ہو تیزیاں
بزمِ دشمن میں میرا رنگ طبیعت دیکھنا

جاتے جاتے خط مرا دینا نہ ان کو نامہ بر
پہلے موقع دیکھنا ان کی طبیعت دیکھنا

اے فداؔ یوں دیکھ لینا ان کا کچھ اچھا نہیں
دیکھنا تو دیدۂ دل میں وہ صورت دیکھنا

بخشا گیا تو اور خطا کار ہو گیا
میں شوق مغفرت میں گنہگار ہو گیا

آنکھوں کو ہے طلب تو یہ آنکھیں ہیں دید کی
دل کیوں کسی کا طالب دیدار ہو گیا

قسمت مری پھری تو زباں ان کی پھر گئی
اقرار لب تک آتے ہی انکار ہو گیا

داغِ فراق آپ کا لالے کو کم نہ تھا
ہر پھول کس لئے جگر انگار ہو گیا

دل کا قصور تھا تو فداؔ دل کو باندھتے
کیا تھی مری خطا کہ گرفتار ہو گیا

کمالِ خاکساری ان کے وفا پر یوں عیاں ہوتا
کہ پیدا میرے ہر سجدہ سے ان کا آستاں ہوتا

جو میں تجھ میں نہاں ہوتا جو تو مجھ میں عیاں ہوتا
تو بس نام و نشاں میرا تیرا نام و نشاں ہوتا

میرے ارمان دل باہم جو اپنا حال کہہ سکتے
تو پھر کہنے ہی کیا تھے گھر کا گھر اہل زباں ہوتا

نصیب دشمناں دست تسلی تم جو رکھ دیتے
تو میرا درد دل آخر کہاں جاتا کہاں ہوتا

ہوا تو کیا ہوا کمبخت سنگ تربت عاشق
اسے پتھر ہی ہونا تھا تو یہ قلب تپاں ہوتا

خیال غیر ہی کرتا مرادوں کی نگہبانی
بھرے گھر کا مرے آخر تو کوئی پاسباں ہوتا

نمک کیا کیا ملا جاتا نہ زخم تیغ قاتل میں
اگر ہنستا ہوا بسمل کا زخم بے نشاں ہوتا

نسیم قدر لے اڑتی اگر اس کی نوا سنجی
فدا بھی ہم صفیر بلبل ہندوستاں ہوتا

یہ کچھ شوق ستم اچھا نہ کچھ لطف وفا اچھا
مگر ہاں مٹنے والوں کا ہے اندازِ فنا اچھا

شہید ناز کروٹ تک بدلنے کو ترستے ہیں
خدنگ ناز کے آرام کو پہلو ملا اچھا

پریشاں کر دیا اس نے چمن کے سونے والوں کو
سندیسہ لے کے آئی زلف کا باد صبا اچھا
عذاب حشر سے چھوٹے تیرے کوچہ کے سودائی
قیامت کا تیری چالوں نے روکا راستہ اچھا
خط پیشانیِ بسمل کا پڑھنا تھا بہت مشکل
مگر تیرِ ستم نے اس کے لکھے کو پڑھا اچھا
کوئی قاتل اداراہ عدم میں ساتھ کر دیجے
کہ اک تنہا مسافر کا کٹے گا راستہ اچھا
بس اتنا ہے کہ استادوں کا اپنے نام لیوا ہے
غلط ہے یہ کہ ارباب سخن میں ہے فدا اچھا

تیرے بیمار پہ احسان مسیحا نہ ہوا
یہ بھی اچھا ہی ہوا کچھ کہ وہ اچھا نہ ہوا
خود تمہیں حسن نمائی کا سلیقہ نہ ہوا
پھر نہ کہنا کہ کوئی دیکھنے والا نہ ہوا
نہ ہوا ترک میرا ہجر میں رونا نہ ہوا
نہ ہوا بند یہ بہتا ہوا دریا نہ ہوا
وہی امید تھی میری جو برآئی نہ کبھی
وہی وعدہ تھا ترا جو کبھی پورا نہ ہوا
چھا گیا دودِ جگر بن کے گھٹا مقتل میں
بسملوں پر تیرے دامن کا بھی سایہ نہ ہوا

داغِ بیداد ہے یہ آپ کے دھوتے ہیں
آپ کا کھیل ہوا خون تمنّا نہ ہوا

یاں بھی آئے تو وہ ڈالے ہوئے زلفوں کا نقاب
روزِ محشر بھی مری شب کا سویرا نہ ہوا

زعمِ ناکردہ گناہی پہ پشیماں نہ ہوا
پاک زاہد کا کبھی دامنِ عصیاں نہ ہوا

یوں تو ہیں لاکھ سیہ کارِ محبت لیکن
طور کی طرح کوئی سوختہ ساماں نہ ہوا

ایک وہ حسن ہے پردہ بہ پردہ پنہاں
ایک وہ عشق کہ پردے میں بھی پنہاں نہ ہوا

چشمِ مشتاق سے حیرت کا اُٹھاتے پردہ
اُن کے جلووں سے بھی یہ کارِ نمایاں نہ ہوا

آفریں باد بریں ہمت مردانہ دل
کبھی پسپائے محبت سرِ میداں نہ ہوا

جستجو میں آپ کی اک التجا تھی میں نہ تھا
آستاں بوسی کو کیا میری دعا تھی میں نہ تھا

تھا اگر جرمِ محبت، میں نہ کیوں پکڑا گیا
کیا گرفتاری کو اک میری خطا تھی میں نہ تھا

مجھ پہ میرا کیوں غلط فہمی کو دھوکا ہو گیا
میری صورت میں وہ شکلِ دلربا تھی میں نہ تھا

اک جھلک سے جس کی بیخود حضرت موسیٰ ہوئے
جلوہ کہتا ہے لدائے مصطفےٰ تھی میں نہ تھا

اُن سے کہتا ہے میرا حال پریشاں بار بار
آپ کے سر آپ کی زلفِ رسا تھی میں نہ تھا

خاکسارانِ محبت سے یہ رُو گردانیاں
گھومنے کو اُنکے کوچہ میں ہوا تھی میں نہ تھا

آپ کی بے چینیاں ناحق ہوئیں مجھ سے خفا
اس قدر گستاخ وہ آہِ فدا تھی میں نہ تھا

پڑ گئی جس پر نگاہِ مست وہ مستانہ تھا
چل گیا جو اُن کے ہاتھوں سے وہی پیمانہ تھا

کر دیا برقِ نظر نے خاک کوہِ طور کو
اس خطا پر بس کہ حُسنِ ذات سے بیگانہ تھا

جلوہ حُسنِ تباں میں کب نہ تھی اُن کی جھلک
کون کہتا ہے کہ یہ کعبہ کبھی بُت خانہ تھا

تھے شبِ اسریٰ میں حسن و عشق کے راز و نیاز
خود ہی مہمانِ عزیز اور خود ہی صاحب خانہ تھا

مرنے والوں میں فدا اچھا رہا یادش بخیر!
لاکھ دیوانوں میں اُنکے ایک ہی دیوانہ تھا

خُدائی سے شانِ خدا بن کے آیا!
کہاں سے کہاں کیا سے کیا بن کے آیا

وہ جلوہ جو تھا خلوتِ لم یزل میں
وہی صورتِ مصطفیٰؐ بن کے آیا

کبھی اُن کی تصویر بے ہوشیوں میں
دل بے خبر آئینہ بن کے آیا !!

کبھی اور نبیوں کے دیکھے تماشے
کبھی خاتم الانبیاء بن کے آیا !

مبارک کہ کثرت کی یکتائیوں میں
وحید آج شکلِ فدا بن کے آیا

کیا بھروسہ ترا اے رحمت غفار نہ تھا
کیوں گنہگار یہ کہتا کہ گنہگار نہ تھا

کیا سزا زلفِ نباں کو ملی اے داورِ حشر
اُن سے بڑھ کر تو کوئی اور سیہ کار نہ تھا

تھا تو اک نقشِ قدم خاک نشینوں کا نصیب
کوئی سوتا ہوا فتنہ دمِ رفتار نہ تھا

عینِ توحید تھی ناقوس و اذاں کی تکرار
کس صدا میں تری یکتائی کا اظہار نہ تھا

طور کو مفت ملی تیرہ درونی کی سزا
یہ سیہ بخت تو کچھ طالبِ دیدار نہ تھا

اپنی بخشش کی قسم بخشنے والے کی قسم
میں نے ہرگز نہ کہا تھا کہ گنہگار نہ تھا

اے فدا تھا یہ فقط پاسِ زبانِ اُردو
ورنہ دشوار بھی کہنا مجھے دشوار نہ تھا

خوب مانگا آئینہ سے روئے انور کا جواب
اب برابر کی ہیں چوٹیں اب برابر کا جواب

آنکھیں مل مل کر مرے تلووں سے چھالے بڑھ گئے
پاؤں پڑ پڑ کر دیا ہے دیدۂ تر کا جواب

توبہ توبہ ابرِ گریاں اور مرے اشکِ رواں
روتی صورت کیا بنے گی دیدۂ تر کا جواب

نقشِ پا اُن کا مٹاتا ہے مرا اشکِ رواں
وائے قسمت پاؤں سے ملنے لگا سر کا جواب

بوئے گیسو میں بسا ہے حسرتوں کا بال بال
ہے دلِ وحشت زدہ زلفِ معنبر کا جواب

قافیہ تبدیل کر کے بھی فدؔا ہو اک غزل
نظمِ شیریں ہو مری قندِ مکرر کا جواب

چاہتی ہے تو اگر چاک گریباں کا جواب
وحشتِ دل ڈھونڈ لا زلفِ پریشاں کا جواب

کی غمِ ہجراں نے یہ کایا پلٹ دن رات کی
بن گئی صبحِ وطن شامِ غریباں کا جواب

میرے گریہ نے مرے اعمالِ بد سب دھو دیئے
دامنِ رحمت ہوا دامانِ عصیاں کا جواب

ہے مرا حالِ پریشاں اُن کی زلفوں کی نمود
اُن کی زلفیں ہیں مرے حالِ پریشاں کا جواب

آپ کا چہرہ مری اُمید کی آنکھوں کا نور
آپکے گیسو مری شب ہائے ہجراں کا جواب

حسرتِ دیدار کا دل بے حجابی آپ کی
آپ کا پردہ مرے اسرارِ پنہاں کا جواب

اک ذرا میں ٹوٹ جانا کوئی اس سے سیکھ جائے
قلبِ نازک ہے ہمارا اُن کے پیماں کا جواب

ہر گھڑی اُن کا تغافل یاد کا میری بدل
میرا ہر دم یاد کرنا اُن کے نسیاں کا جواب

اُس فصیح بے بدل کے نام لیوا ہے فدا
ملا سے نے اب تک نہ پایا جس سخنداں کا جواب

اک نظر میں ہو گئی نرگس گرفتارِ شباب
کیوں پرائی آنکھ کر دی تم نے بیمارِ شباب

ہم نگاہِ شوق کو سمجھائے دیتے ہیں مگر
آپ پائیں گے کہاں ایسا نگہدارِ شباب

بٹ گئے کچھ پھول کچھ غنچوں کے حصے میں رہا
بٹ گیا گلشن میں اُنکا رنگِ رخسارِ شباب

حُسن بے پردہ بھی ہے اُن کی جوانی کا اسیر
اُن کے گیسو ہی نہیں تنہا گرفتارِ شباب

بے مراد و دجگر بھی گیسوئے مشکیں کے ساتھ
بکنے جاتے ہیں اگر بازار سیہ کارِ شباب

بے پر دل کیوں اڑے نہ رنگِ گلاب
یہ بھی رخسارِ یار کا ہے نقاب

تیرے دھوکے میں لے دل بیتاب
پکڑی جاتی ہے ماہیٔ بے آب

تھی زلیخا کو پہلے اُس کی تلاش؛
اب زلیخا کو ڈھونڈتا ہے شباب

کس سے پوچھیں کہ آج شیشے میں
قید کیوں ہوگیا عزیب گلاب

کوئی محشر میں ڈھونڈتا ہے مجھے
ہو نہ ہو ہے مرا یہ عہدِ شباب

اب نکیرین سے خدا کہہ دو
جا ہیئے ہو چکے سوال و جواب

کس کشاکش میں ہے یارب آج جانِ اضطراب
ضبط پہ بھی دل کو ہوتا ہے گمانِ اضطراب

بجلیاں گر کر دلِ مضطر کے لیتی ہیں قدم
اور اب بڑھ کر کہاں جائے گی شانِ اضطراب

وہ سنا دے ہوش میں آکر اُنھیں لے بیخودی
جو خموشی نے کہی تھی داستانِ اضطراب

اُس کے منہ تک کب کبھی آتا تھا بھلا رازِ سکوں
کس خطا میں کاٹی جاتی ہے زبانِ اضطراب

یوں دلِ مضطر کو سینے سے لگا کر رکھ لیا
اے فداؔ آباد ہے اس سے جہانِ اضطراب

شانِ نیرنگی میں آیا جو نگارِ وحدت
کثرتیں ہونے لگیں آ کے نثارِ وحدت

ذرہ ذرہ سے انا الکیف کی آتی ہے صدا
اس کو کہتے ہیں نشہ یہ ہے خمارِ وحدت

اے مری آرزوئے دید تری عمر دراز
اک ترے دم سے ہے آباد دیارِ وحدت

ڈھونڈتے ہیں مئے نیرنگ کے پینے والے
چڑھ گیا کون سے زینے سے خمارِ وحدت

کثرتِ جلوہ میں کیوں ہے کسی وحدت کی تلاش
آپ جب خود ہیں فداؔ آئینہ دارِ وحدت

وہ سماں وہ رنگ ہوا ہوا چمن دوئی کی بہار کا
تری اک جھلک نے اٹھا دیا جو حجاب تھا گل و خار کا

مری چشمِ مست میں چھائے کیوں نہ وہ رنگ پہلی بہار کا
کہ قریب ساغرِ گل سے ہے کوئی رشتہ میرے خمار کا

رہے بے نمودِ ان جمال میں سر اسی کے سہرا بہار کا
جو نسیمِ صبح کھلا سکے کوئی پھول شمع مزار کا

چمنِ جراحتِ عشق میں یہ رواں ہے حکم بہار کا
کہ ہزاروں پھولوں میں رنگ ہے، ترے ایک سینہ فگار کا

جو کسی کی جان سجود تھا کسی نقشِ پا کی نمود تھا
شبِ غم کے تاروں میں گم گیا وہی ذرہ میرے غبار کا

کہیں ہے تجلّیِ ذات میں کہیں اس کا جلوہ صفات میں
بڑے ہوش والوں میں بٹ رہا ہے اثاثہ میرے خمار کا

مرا اضطرار سکونِ دل مری راحتیں ہیں جنونِ دل
کسی چشمِ شوخ کا صاعقہ ہے جلیس میرے قرار کا

مرے سوزِ سجدہ کی خاک کو وہ ملی جلالتِ بندگی
کہ ہر ایک ذرہ نقیب ہے، ترے سنگِ در کے شرار کا

یہ سیہ کار کو دی سزا مری آرزوئے جمال نے
کہ ہوائے صبح بجھا رہی ہے چراغ ہی شبِ تار کا

ملے لطفِ آہِ شرر فشاں جو کسی کے سوزِ فراق میں
تو ستارے ٹوٹ کے دم بھریں ترے سنگِ در کے شرار کا

یہ جنوں کی رتبہ شناسیاں یہ جنوں کی قدر فزائیاں
جو الجھ کے آبلہ رہ گیا وہی تاج تھا سرِ خار کا

میں فدائے جلوۂ راز ہوں میں امینِ رازِ نیاز ہوں
نہ انا کے جام کا ہوش ہوں نہ جنون ہوں سرِ دار کا

حسن کو ساقیٔ میخانہ بنایا ہوتا
عشق کو لغزشِ مستانہ بنایا ہوتا

پھول بھی اُن کے تبسم کو دعائیں دیتے
برگِ گُل کو لب پیمانہ بنایا ہوتا
میں چمن میں بھی نہ ہوتا کبھی ممنونِ بہار
بجلیوں میں مرا کاشانہ بنایا ہوتا
قیس تنہا ہی رہا رونقِ بازارِ جنوں
کچھ تو لیلیٰ کو بھی دیوانہ بنایا ہوتا
خرقہ پوشانِ جنوں خاک اڑاتے جاتے
رُخ بگولوں کا فقیرانہ بنایا ہوتا

لے لیا گود میں قاتل نے پشیماں ہو کر
بڑھ گیا دل کا کلیجہ تہہ داماں ہو کر
مجھ سے سو درجہ مرا حالِ پریشاں اچھا
کہ اسے دیکھ رہے ہیں وہ پریشاں ہو کر
حیرتِ آئینہ کو یوں ہے کہ تمہیں دیکھا ہے
تم کسے دیکھ کے رہ جاتے ہو حیراں ہو کر
دل سے جانے کا بہانہ ہے کہ فرماتے ہیں
زخمِ دل چھیڑتے ہو کیوں ہمیں خنداں ہو کر
کشتۂ ناز دمِ نزع کسے دیکھ لیا
کیوں کھلی رہ گئیں آنکھیں تری حیراں ہو کر
کبھی مجروح بنایا کبھی مرہم رکھا
درد بن کر کبھی آئے کبھی درماں ہو کر

ہم ہیں ہر وقت فدا محوِ تماشائے جمال
نہ کہ آئینہ کہ تکتا ہے حیراں ہو کر

نقشِ قدم زمیں پہ قدم آسماں پہ
سایہ ہے پائے ناز کا دونوں جہاں پہ

ساتھ اُنکے میرا طالع بیدار سو گیا
آئی جو نیند اُن کو مری داستان پہ

دشمن تو یوں بچا کہ وہ دشمن کا دوست ہے
اللہ میرا صبر پڑے کس کی جان پہ !!

قاتل بھی کچھ اداس ہے مقتل بھی کچھ اُداس
جانباز کون کھیل گیا اپنی جان پہ

ہے عید آج گردوں نشیں کے گھر
ملنے گیا ہے کس کا دماغ آسماں پہ

یوں گئے دل سے ہمارے وہ پشیماں ہو کر
یاد بھی اُن کی رہی سر بگریباں ہو کر

گردنیں جھک گئیں شیشوں کی خمارے سے
دور ساغر بھی چلا مجلس عرفاں ہو کر

چھیڑ بھی ہے یہ مزے کی کہ بگڑ کر سر بزم
دل میں آ بیٹھے مرے رنجشِ پنہاں ہو کر

میری وحشت مجھے دیتی ہے دلاسے کیا کیا
میرے بازو پہ تیری زلف پریشاں ہو کر
مجھ تک آتے ہی مرے دل کی طرح ٹوٹ گیا
ساغرِ مے بھی تو، آیا تیرا پیماں ہو کر

نیا جادو کیا یہ کس نے آنکھوں سے نہاں ہو کر
میں اپنی جستجو میں کھو گیا اُن کا نشاں ہو کر
تجھے کس نے بتایا راستہ اتنا بتاتا جا
عدم کے جانے والے جائیگا آخر کہاں ہو کر
کرے کیا کوئی ہمدردی ضعیفانِ محبت کی
اثر بھی گھر لٹا بیٹھا طرفدارِ فغاں ہو کر
اسے سرکا رہا ہے پھر کسی کا شوقِ پامالی
نکالے پاؤں مٹی نے مری ریگِ رواں ہو کر
سکھا دیں تم نے اس کو بھی ادائیں پردہ داری کی
تمہاری طرح دردِ دل بھی رہتا ہے نہاں ہو کر

کسی خلوت میں رہتے جلوۂ شام و سحر ہو کر
بہت پچھتا رہے ہیں مرے اجزا منتشر ہو کر
قیامت میں جو ڈرتا ہوں تو اشکوں کی غمازی سے
کہیں کچھ یہ نہ کہہ گذریں زبانِ چشمِ تر ہو کر

مری ہر جنبشِ دل میں ہے آہٹ پائے نازک کی
وہ جائیں گے کہاں بچکر وہ جائیں گے کدھر ہو کر

خلاف اُنکے اشارے کے جو ذرہ تک نہیں ہلتا
ہمارے نیک و بد کیوں لکھے جائیں خیر و شر ہو کر

دیئے جاتے ہیں دھوکے زندگی کے نقشِ فانی کو
کہ رہ جاتا ہے ہر ہر سانس مشتاقِ سفر ہو کر

اے مرے ہست و نیست کو ہم ساز
سانس ہیں کس کے ساز کی آواز

اے تری ذرہ پروری کے نثار
بن گیا آفتاب داغِ نیاز

مجھ سے پھرتی نہیں نگاہِ کرم
ہوں میں وہ منظرِ نگاہ نواز

ہوں جہاں بھی رسائیاں تیری
وہیں لے چل مجھے جبینِ نیاز

دو فدا اپنے سوز کا صدقہ
شمع رو رو کے مانگتی ہے گداز

کان میں پھول کے کیا کہہ گئی آہِ بلبل
بوئے گل باغ میں ہے چشم براہِ بلبل

کس گلؑ اندام کی آمد ہے کہ پابوسی کو
ہر روش پہ بچھی جاتی ہے نگاہِ بلبل

ایسی بیدردی سے کم بخت خزاں نے کھینچا
دھجیاں ہو گیا دامانِ نگاہِ بلبل

اُڑ گئی باغ سے سنتے ہی خزاں کی آہٹ
بن کے آئی تھی صبا پشت و پناہِ بلبل

فنا بقا کے کرشمے دکھائے جاتے ہیں
ہمیں مٹا کے وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

یہی ہے راہِ محبت تو اُف خدا کی پناہ
کہ بے چلے بھی قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

خبر بھی ہے تجھے لیلیٰ کہ چشم و دل کے سوا
نئے نئے ترے محمل بنائے جاتے ہیں

کرشمہ سازی الفت کے انقلاب نہ پوچھ
بگاڑے جاتے ہیں وہ جو بنائے جاتے ہیں

خدا وہ تجھ میں سراپا سما چکے ہیں تو پھر
یہ فرش آنکھوں کے اب کیوں بچھائے جاتے ہیں

مزہ ہر رنگ کا پاتا ہوں اپنے کیفِ طاعت میں
کبھی مجھ میں محبت ہے کبھی میں ہوں محبت میں

نہیں جب امتیاز اپنے پرائے کی محبت میں
جیوں نرگس کی صورت ہیں مردِ نرگس کی فرقت میں

اُنھیں آنکھوں پہ چھلک کے لیے ادب اے سیہ کاری
وہی چھینٹے امانت ہیں جو میری ابرِ رحمت میں

ہر اک صورت کو جب دعویٰ ہے اُنکے حسنِ پنہاں کا
الٰہی اب اُنہیں ڈھونڈوں تو ڈھونڈوں کس کی صورت میں

دلِ پُر داغ کو اُنکا تبسم چھیڑے جاتا ہے !
مرے سوزِ دروں کے پھول ہیں دامانِ رحمت میں

صدا شکستہ دلوں کی صدائے عام نہیں
صدائے دل ہے صدائے شکستِ جام نہیں

الٰہی خیر یہ کیوں پڑ گیا کشاکش میں
ہمارے سانس کو اللہ کیوں قیام نہیں

یہ کیا طلسم ہے یارب کہ تیری دنیا میں
سب آدمی ہیں مگر آدمی کا نام نہیں

تمہیں پہ کیوں ہے یہ الزام جور کی بوچھار
تمہارا نام تو کچھ آسماں کا نام نہیں

مرے یقیں میں نہیں یا مرے گماں میں نہیں
ترا جمال دل افروز کس مکاں میں نہیں

تلاش ہستی آوارہ لے خدا حافظ
کہیں ٹھکانہ ترا عمر رائیگاں میں نہیں

ثبوتِ سجدۂ طاعت کہاں ملے یا رب
نشان ہی کوئی اُس سنگ آستاں میں نہیں

بھٹکتی پھرتی ہے یا رب کہاں فغانِ جرس
سراغ اس کا کہیں شورِ کارواں میں نہیں

چڑھائے تربت بلبل پہ کیا ہوائے چمن
کہ ایک پھول کسی شاخ گل فشاں میں نہیں

جناب خضر کو سمجھا رہے ہیں کشتۂ ناز
مزہ حیات کا کچھ عمر جاوداں میں نہیں

نیا اٹھے کوئی پردہ بہار گلشن کا
یہ سبز باغ تو کچھ شرح داستاں میں نہیں

تجلیات کو اے خلوتی نہ کر محدود
وہ ہر مکان میں ہے کونسے مکاں میں نہیں

بہارِ باغ کو بلبل جواب کیا دے گی
کہ شاخِ گل کی امانت بھی آشیاں میں نہیں

شہید ناز ہوں آسودۂ دامان قاتل ہوں
ہزاروں بسملوں میں چشم بددور ایک بسمل ہوں

بھلا اے خضر راہ بیخودی حد بھی تغافل کی
کہ میں اپنے پتے کے واسطے گم کردہ منزل ہوں
مجھے خنجر بھی رکھنا ہے عزیز اور قلب بسمل بھی
کبھی امید قاتل ہوں کبھی ارمان بسمل ہوں
مجھے ہستی ہے میری نیستی اور نیستی ہستی
کبھی مرنے پہ عاشق ہوں کبھی جینے پہ مائل ہوں
مری آسانیاں دشوار مشکل میری آسانی
میں آسانی کی آسانی ہوں اور مشکل کی مشکل ہوں
کمال شاعری کا اے خدا دعویٰ نہیں مجھ کو
میں اس حالت میں کیا کم ہوں نہ ناقص ہوں نہ کامل ہوں

دوسرا کعبہ بن گیا ان کے حریم ناز میں
سجدوں کا داخلہ ہوا بارگہ نیاز میں
لطف وصال مل گیا مجھ کو مرے نیاز میں
مجھ میں نماز ہے کبھی میں ہوں کبھی نماز میں
آئے تو کس بہار سے گلکدۂ مجاز میں
سینکڑوں پھول کھل گئے گلشن امتیاز میں
شوق فنا میں آئیں تھیں میری نیاز مندیاں
ان کا بھی ہے پتہ کہیں آپ کے کوئے ناز میں
ذرے چمک کے بن گئے دیدۂ شوق کے نصیب
مفت خزانے مل گئے اُن کو رہِ حجاز میں

آہ مری پلٹ پڑی ان کی نگاہ دیکھ کر
میرا ہی تیر کھنچ گیا ان کی کمان ناز میں

مجھ کو جھکانے آئیں کیوں آپ کی بے نیازیاں
میرا غرور تو نہ تھا میرے سر نیاز میں

جسکو اشارہ مل گیا اس کا نصیب کھل گیا
اے تری شان یہ کمال ابروے کارساز میں

حشر کا نام چل گیا حشر نے گود لے لئے
فتنے جو تھے پلے ہوئے ان کے خرام ناز میں

جوش کرم کی ہے صدا کیف کا وقت آ گیا
پیاسو چلو سبیل ہے میکدۂ نیاز میں

باب کرم جو کھل گیا کھل گئی قسمت فدا
اس کو خزانے مل گئے بارگہ نیاز میں

ٹھنڈی سانسوں میں مری شکوۂ بیداد نہیں
تجھ سے تو کوئی گلہ اے ستم ایجاد نہیں

شکوہ کرنا دل بسمل تری کم ظرفی ہے
مشغلہ اہلِ جفا کا کوئی بیداد نہیں

سوکھے پھولوں کو بھی رکھ لیتی ہے آنکھوں پہ خزاں
ایک تنکا بھی چمن کا مرے برباد نہیں

نظر آتا ہی نہیں حدِ نظر سے آگے
آپ کا جلوہ بھی محدود ہے آزاد نہیں

آپ افسردہ نہوں آپ کچھ آزردہ نہ ہوں
یہ میری رات کے سناٹے ہیں فریاد نہیں
داغ کے ساتھ فدا شوکتِ اُردو بھی گئی
واقعہ ہے یہ ثنا خوانیٔ استاد نہیں

خموشیوں میں کبھی ہے کبھی اشاروں میں
جلوس آپ کا ہے نت نئی بہاروں میں
یہ راہ عشق ہے اے سجدہ ادب ہوشیار
کسی کا نقشِ قدم ہے نگاہ داروں میں
الٰہی قبلہ ہے یا قبلہ ساز کی تصویر
ہے منہ ہر ایک کا کس کی طرف نظاروں میں
ملا ہے خاک میں صرف اس اُمید پر یارب
کہ انتخابِ فدا بھی ہو جاں نثاروں میں

کبھی جو مسجود تھا تمہارا مجھے نہ بھولو کہ میں وہی ہوں
فرشتو دیکھو میری ادائیں کہ چشمِ بد دور آدمی ہوں
جہانِ ہستی ہے مجھ سے روشن وہ مہرِ خوشتابِ زندگی ہوں
یہ ہے عروجِ وصال میرا کہ ہم کنارِ فروتنی ہوں
کسی کی برقِ نظر کو جس نے لیا ہے آنکھوں پہ بیخودی میں
وہ طور کا قلب سوختہ ہوں وہ چشمِ مشتاقِ موسوی ہوں

مرا قرینہ ہے سینہ صافی عمل محبت کی موشگافی
وفا کی زینت ہے میرے دم سے کرشمۂ زلفِ عاشقی ہوں

وہ برہمن ہوں کہ بہر قشقہ ملا ہے رازِ الف کا پردہ
کھلوں تو کیا کفر دیں کہیں گے کہ آپ کا سرِ مختفی ہوں

متن وہ ہوں جس کے حاشیے میں جدا ہیں الفاظ سے معانی
کتابِ عرفاں کے ترجمے کی میں شرحِ احوال واقعی ہوں

خدا ہی جب میرا نام ٹھہرا تو عشق میں یہ حجاب کیسا
بُت کے مشتاق مجھکو دیکھیں کہ صاف تصویر واجدی ہوں

کونسی منزل ہے میری کونسی منزل میں ہوں
مجھ میں میرا دل ہے یارب یا میں اپنے دل میں ہوں

آپ بھی ہیں میرے دل میں آپ کے جلوے بھی ہیں
میرا گھر بھی ہے کہیں میں بھی کسی کے دل میں ہوں

قیس کو ہے میری دھن لیلیٰ کو ہے میری تلاش
کون محمل بتاؤں کون سے محمل میں ہوں

عالم آرا ہوں مگر ہے بے حجابی سے گریز
گوہرِ نایاب ہوں گو دامنِ ساحل میں ہوں

اے خدا مشکل کشا ہی جب کسی کا نام ہو!
کیوں پھر آسانی کو شکوہ ہو کہ میں مشکل میں ہوں

ہم دستِ ستمگر تجھے کیا دیکھ رہے ہیں!
مٹھی میں تری اپنی قضا دیکھ رہے ہیں

ہر چند جو تری زلف دوتار دیکھ رہے ہیں
ہم اپنے مقدر کو خفا دیکھ رہے ہیں

آ بھی کہیں پیغام کسی زلف کا لا بھی
ہم راہ تری بادِ صبا دیکھ رہے ہیں

کیا دیکھتے تھے وعدہ اغیار سے پہلے
اب دیکھنے والے نہیں کیا دیکھ رہے ہیں

جاگے گی ضرور آج تو سوئی ہوئی قسمت
وہ شام سے تصویرِ فدا دیکھ رہے ہیں

قدم سے اے فلک اِن کے یہ اہلِ دل کے نالے ہیں
بڑے پہنچے ہوئے ہیں یہ بڑے اللہ والے ہیں

یہ اچھی بے حجابی ہے یہ اچھی پردہ داری ہے
کہ پردے بھی مرے دل پر مری آنکھوں کے ڈالے ہیں

بس اب اے حسرتِ دیدار ہے تیرا خدا حافظ
وہ آنکھوں تک نہیں آتے جو دل کے رہنے والے ہیں

فدا کیا لطف اب بزمِ سخن میں شعر خوانی کا
نہ وہ دادِ سخن ہے اب نہ وہ اب سننے والے ہیں

بھلا دستِ جنوں تقسیم سودا کیوں ہے الجھن میں
گریباں کی گریباں میں رہے دامن کی دامن میں

دلِ بسمل نگاہِ شوخ کا تنہا نہیں بسمل
کلیجہ تھامے بیٹھی ہے حیا بھی ان کی چتون میں

بھرے بیٹھے ہیں چھیڑ اچھی نہیں ایسے میں دونوں کی
کہیں اے جوشِ وحشت چل نہ جائے جیب و دامن میں

چراغ آیا چڑھانے وہ ستمگر میری تربت پہ
مری تقدیر چمکی بھی تو چمکی آ کے مدفن میں

فدا دل چھین کر اب وہ مجھے رستہ بتاتے ہیں
ادائے رہنمائی بھی ہے کچھ کچھ میرے رہزن میں

تصویرِ ذات ہوں میں یا رنگِ ماسوا ہوں
اللہ کس سے پوچھوں میں کون ہوں میں کیا ہوں

وہ اور میری آنکھیں میں اور ان کے جلوے
اللہ جاگتے میں کیا خواب دیکھتا ہوں

آنکھیں ترے نہیں ہیں کیا آفتابِ محشر
کیا دیکھتا ہے زیرِ دامانِ مصطفٰےؐ ہوں

اے ان کی بے نشانی میرا نشاں بتا دے
اپنی ہی جستجو میں میں آپ کھو گیا ہوں

کیا یہ عروج کم ہے میرا نیازیوں میں
ہیں آپ پر فدا ہوں ہاں آپ کا فدا ہوں

دیدۂ وادیٔ ایمن کا تماشا ہوں میں
سو چمن جس سے ہیں آباد وہ صحرا ہوں میں
خود بخود جو نظر آتے وہ تماشا ہوں میں
آپ ہی آپ جو جم جاتے وہ نقشا ہوں میں
تازہ ہو ہو کے مجھے پھول دعا دیتے ہیں
بارش ابر لطافت کا وہ چھینٹا ہوں میں
بحرِ موّاج ہے ہر جزو حقیقت میرا
موجزن جس میں سمندر ہے وہ قطرہ ہوں میں
میری توحید ہے نیرنگیٔ کثرت کا کمال
لاکھ ذروں میں چمکتا ہوں وہ یکتا ہوں میں
ایک جلوے سے مرے دیر و حرم ہیں آباد
شانِ کعبہ ہوں کبھی جانِ کلیسا ہوں میں

عجب انقلابِ نیاز ہے مری سجدہ گاہِ نیاز میں
کبھی مجھ میں میری نماز ہے کبھی میں ہوں اپنی نماز میں

اُسے ڈھونڈتی ہیں خجالتیں اسے تک رہی ہیں ندامتیں
مری وہ خطا جو چھپی ہوئی ہے نگاہِ بندہ نواز میں

کسی شکل پر جو کرم کیا اُسے آپ جیسا بنا لیا
رُخِ غزنوی میں چمک اٹھی جو جھلک تھی رُوئے ایاز میں

جو ادا ہوئی وہ قضا ہوئی جو قضا ہوئی وہ ادا ہوئی
وہی اک سجدۂ سہو تھا مری بے خودی کی نماز میں

جو فدا کے ہجر کی جان تھے جو دلِ حزیں کے مکان تھے
انہیں گیسوؤں کی ادائیں تھے مرے شکوہ ہائے دراز میں

کس کی تجلیوں میں ہوں کس کی نگاہِ ناز ہوں
کس کے سرورِ حسن کا دیدۂ نیم باز ہوں

بزمِ صفائے عشق میں میری لطافتیں نہ پوچھ
دیدۂ خود پرست کی راحتِ خوابِ ناز ہوں

اپنے وجود کی قسم، تیری نمود کی قسم،
ہوشِ شہودِ مست ہوں بیخودِ امتیاز ہوں

ہوں وہ حقیقتِ آشنا معرفتِ نمود میں
شانِ سریرِ عشق ہوں تاجِ سرِ مجاز ہوں

ہوں وہ فدائے باخبر بے خبرِ یک و دگر
محوِ جمالِ وحدہ ہوں مستِ مے نیاز ہوں

جو چمن ہے مجھ سے کھلا ہوا میں اسی کی تازہ بہار ہوں
مرے ہر نفس کو یہ ناز ہے کہ ہوائے گلشنِ یار ہوں

مرا داغِ عشق ہے گل فشاں مرا باغباں ہے تپ نہاں
کوئی پھول مجھ پہ چڑھائے کیا کہ میں خود بہار مزار ہوں

ہیں ادائے جور پسند ہوں میں وفا کی شانِ بلند ہوں
مرے لاکھ بسملِ ناز ہیں وہ تبسمِ لب یار ہوں

مری ہست و نیست مٹا گئے مجھے آپ جیسا بنا گئے
مگر اس پہ بھی نہ بتا گئے کہ میں کس چمن کی بہار ہوں

سترِ حق کا بیاں ہے اللہ
جلوۂ لامکاں ہے اللہ

آپ ہی کا پتہ ہے الا اللہ
آپ ہی کا نشاں ہے اللہ

سارے منظر ہیں نقشۂ موہوم
خود مکیں خود مکاں ہے اللہ

اے فدا لے یہ روح کی سوغات
تحفۂ عاشقاں ہے اللہ

پرائے منہ سے بھی افشاں مرا رازِ نہاں کیوں ہو
دھانِ زخم میں ناوک بھی ظالم کی زباں کیوں ہو
تو کیا آئی ہے یہ لے کر بلائیں انکی زلفوں کی
جنابِ دل نسیم صبح سے تم بدگماں کیوں ہو

پکاریں حسرتیں کس کو جو تم دل سے نکل جاؤ
نہ ہو مالک ہی کعبہ کا تو کعبے میں اذاں کیوں ہو

جو ساتھی ہے تو پھر وصل میں بھی ساتھ کیوں چھوڑے
اکیلا ہجر کا ہمدم مرا سوزِ نہاں کیوں ہو

تلاشِ زخم کا اے چارہ گر آخر نتیجہ کیا
نظر آتا نہیں جب تیر تو اُس کا نشاں کیوں ہو

مئے نوشیدہ کس شیریں دہن کی مل گئی تم کو
فداؔ تو سچ بتا دو آج اتنے خوش زباں کیوں ہو

کیا جاں نثار جس میں کمالِ فنا نہ ہو
کیا دِل وہ جس کو گمشدگی میں بقا نہ ہو

پردہ ہی ہے تو سامنے پھر آئینہ نہ ہو
خِلوت وہی ہے جس میں کوئی دوسرا نہ ہو

دِل ڈھونڈنے کو نکلے ہیں دل کی تلاش ہے
لیکن وہ دل کہ جس میں کوئی مدّعا نہ ہو

اے شوقِ دید کوچۂ گیسو سے بچ کے چل
کعبے کے جانے والوں کا یہ راستہ نہ ہو

آئینہ دیکھنے میں ذرا یہ بھی دیکھ لو
تم سا ہی اس میں تم کو کوئی دیکھتا نہ ہو

سنئیے بہارِ زخمِ جگر کی حکائتیں
گلزارِ داغ آپ نے شاید سنا نہ ہو

پنکھے سے یوں وہ چونک گئے اُف رے احتیاط
اس میں کسی کے دامنِ دل کی ہَوا نہ ہو

میرے پکارنے پہ یہ کہنا کسی کا ہائے
آواز تو اسی کی ہے دیکھو فِدا نہ ہو

تڑپنے ہی کی ٹھہری ہے تو ہر پہلو برابر ہو
اِدھر بھی قلبِ مُضطر ہو اُدھر بھی قلبِ مُضطر ہو

مقدّر ہو ترے مستوں کا تو ایسا مقدّر ہو
کہ ان کو گردشِ قسمت بھی انکی دورِ ساغر ہو

انہیں بھی کچھ مری بے چینیوں کی قدر ہو جائے
الٰہی ان کے سینے میں بھی مرا قلب مضطر ہو

مرا دل دِل رکھے دلبر کا یا ضبطِ محبّت کا
یہ کہتا ہے کہ مضطر ہو وہ کہتا ہے کہ پتھر ہو

دُعائیں دے رہے ہیں دِل کو مرے سامنے رکھ کر
الٰہی میرا آئینہ نصیبے کا سکندر ہو

کسی بدمست کی فرقت میں پیتا ہی رہوں آنسو
مری آنکھیں کی آنکھیں ہُوں مرا ساغر کا ساغر ہو

ہوس کو سر چڑھانا راہِ الفت میں نہیں اچھّا
فِدا بس پاؤں پھیلانا تم اُتنا جتنی چادر ہو

چمن آرائے کثرت جب بنایا حُسنِ پنہاں کو
بہارِ آفرینش لے اُڑی تصویرِ انساں کو

لیے پھرتے ہیں سر پر اَب تو خاکِ کوئے جاناں کو
بگولے رُٹ کر کیا منہ دکھائیں گے بیاباں کو

یہی ہے گلشنِ دنیا اَزل میں دھوم تھی جس کی
سلام اس کی بہاروں کو سلام اس کے گلستاں کو

بڑی تعظیم سے ہر سانس کو اُٹھ اُٹھ کے لیتا ہے
سکھائے کس نے یہ پہلو ادب کے دردِ ہجراں کو

ابھی شوقِ خلش کیا اور کانٹوں میں گھسیٹے گا
دلِ مجروح کیوں سونپا گیا ہے ان کی مژگاں کو

تھکا جب بے سہارے چلتے چلتے راہِ غربت میں
جنوں انگلی پکڑ کر لے چلا چاکِ گریباں کو

اسے رفتارِ دوراں نے جو اپنا پیشوا پایا
قدم لے کر کیا رخصت مری عمرِ گریزاں کو

کرم اس پہ بھی اب اے اضطرابِ قلبِ پروانہ
گذر جاتی ہیں راتیں کانپتے شمعِ شبستاں کو

دُعا دیجئے مری تہذیبِ وحشت کو دُعا دیجئے
بھلا آپ اور چھپا سکتے مرے حالِ پریشاں کو

خبر کر سائے تمنائے رہائی دست گیروں کو
کہ مارے ڈالتی ہے قیدِ آزادی اسیروں کو

تمنائیں بھٹکتی ہیں ٹھکانہ ہی نہیں ملتا
کسے سونپوں میں ان گم کردہ منزل راہ گیروں کو

سنا ہے نقشِ پا ان کے بڑی دولت لٹائیں گے
چل اے نقشِ جبیں خیرات بٹتی ہے فقیروں کو

نہیں ہٹتا سحر تک شمع سے فانوس کا پردہ
ہمیشہ قیدِ تنہائی رہی روشن ضمیروں کو

وطن اور قدر دانی اہلِ فن کی اے فدا توبہ
کہاں تم یاد کرنے آ کے بیٹھے ہم صفیروں کو

تعین کی کشاکش میں زمیں یا آسماں کیوں ہو
تم ہی تم ہو تو تفریقِ مکان و لامکاں کیوں ہو

ہمارا ہوشِ رفتہ بے نشانی کا نشاں کیوں ہو
ترے ذکرِ خفی کی بے خودی کبھی رازداں کیوں ہو

تعین جس پہ ہو بارِ گراں پھر وہ عیاں کیوں ہو
مکانِ لامکاں کو قیدِ امکانِ مکاں کیوں ہو

مٹانا ہو چکا ہے طے اگر ہر نقشِ ہستی کو
تو اک چھوٹا سا سجدہ بھی نمودِ آستاں کیوں ہو

مرے انفاسِ آوارہ کو جو ڈھونڈے نہیں ملتا
مری روح رواں کا اس چمن میں آشیاں کیوں ہو

حجاباتِ دوئی تو ہین ہیں شانِ وصالی کی
نگاہِ شوق بھی ان کے ہمارے درمیاں کیوں ہو

کسی خلد آشیاں نے کیا کہیں سازِ سخن چھیڑا
فدا تم ہمنوائے بلبلِ ہندوستاں کیوں ہو

کیا کرتو اگر کرتا ہے دار و گیر میخانہ
ترے بس کی نہیں اے محتسب تحقیر میخانہ
کلید باب میخانہ بنے یوں شوقِ مے نوشی
کہ خود کھل جائے بے کھولے ہوئے زنجیر میخانہ

جھکے ہیں کس کے در پہ جھکنے والے بس اُسی در پر
جناب شیخ دیکھی آپ نے توقیر میخانہ
بنی کس گرنے والے کا سہارا چھو لیا کس نے
الٰہی جھومتی ہے کس لیئے زنجیر میخانہ
در و دیوار سے کیوں اس کے بدمستی ٹپکتی ہے
یہ کس مے کش کی مٹی سے ہوئی تعمیر مے خانہ

یونہی بے لفظ و بے معنی رہی گر داستاں میری
بھرے محشر میں یارب کون سمجھے گا زباں میری
کدھر جاتا ہے یارب کارواں بے جرس ان کا
کہاں جاتی ہے کیوں خاموش جاتی ہے فغاں میری
مرے ہر پھول میں ہے رنگ ان کی لازوالی کا
خزاں سے دور رہتی ہے بہارِ جاوداں میری
چمن آرائے فطرت نے بہاریں مجھ کو بخشی ہیں
فضائے جاودانی بن گئیں گل ریزیاں میری
بہارستانِ قربت ہے مری راحت کا گہوارہ
پلی ہے سایہ طوبیٰ میں شاخِ آشیاں میری

مری فریاد ہو اک صاف نقشہ میری صورت کا
فغاں بن جاؤں میں مجھ میں سما جائے فغاں میری

بچھڑتی ہے ہمیشہ کو اگر یہ بے وفا مجھ سے
تو عمرِ رائیگاں کا میں نہ عمر رائیگاں میری

خدا! وہ خوشہ چیں ہوں میں بہارِ باغ عرفاں کا
حقیقت بن کے چمکیں گی کبھی نیرنگیاں میری

دل میں رخِ تاباں کے تنویر نظر آئی
قرآں کی کعبہ میں تفسیر نظر آئی

وہ اور میری آنکھیں اللہ تیری قدرت
کس خوابِ تمنا کی تعبیر نظر آئی

اک پل کا تماشا تھا قرباں ان آنکھوں کے
ہلتی ہوئی حجرے کی زنجیر نظر آئی

کیوں آنکھوں میں آئے تھے کیوں دل میں سمائے تھے
اب کہتے ہو کیوں میری تصویر نظر آئی

کی صورتِ دلکش نے کیا خوب نظر بندی
جو چیز نظر آئی تصویر نظر آئی

جب خاک ہوا سجدہ تو اس کو ملیں آنکھیں
خاکِ قدمِ جاناں اکسیر نظر آئی

مضموں فدا تیرا سمجھے جو سمجھ والے
گویا اُنہیں مجذوبی تحریر نظر آئی

شہرت ہے آج آمد فصلِ بہار کی
تازہ خبر ہے میرے گریباں کے تار کی

مر کر ہوئی یہ قدر دلِ بے قرار کی
بجلی بلائیں لیتی ہے میرے مزار کی

کیا چھو گئی ہوا اُسے دامانِ یار کی
پسلی پھڑک رہی ہے نسیمِ بہار کی

کیا اعتبار ہے نفسِ بے ثبات کا
راسیں چھٹی ہوئی ہیں ہوا کے سوار کی

کیا خوب ہیں فدا تری اختر شماریاں
چادر سجی ہوئی ہے شبِ انتظار کی

بھولے ہیں وہ راہ میرے گھر کی
ہمت تیری سپہرِ فتنہ گر کی

پیروں سے لپٹ گئی قیامت
بگڑی گئی چال فتنہ گر کی

وصل ہو گئی ساعتِ جدائی
ظالم نہ سرکشی تھی نہ سر کی

سوتے سے اُٹھے وہ مسکراتے
کلیاں کھلیں دامنِ سحر کی

کب تک کہے ہجر کی کہانی
جاگی ہوئی آنکھ رات بھر کی

پھر لوٹ پلٹ ہُوا زمانہ
پھر تم نے نظر اِدھر اُدھر کی
انگلی سے نہ چھیڑو زخمِ دل کو
ہے اس کی زباں بالشت بھر کی

کسی کی دھن میں جو دل ہے عجب بہار میں ہے
خدائی بھر کا تماشا خیالِ یار میں ہے
مٹا رہے ہیں وہ نقشِ قدم سے نقشِ جبیں
مرے نصیب کا لکھا خطِ غبار میں ہے
کبھی ہے چشمِ عدو میں کبھی ترے دل میں
ہمارا خارِ تمنا عجب بہار میں ہے
پسِ فنا بھی پلک سے پلک نہیں لگتی
الٰہی آنکھ مری کس کے انتظار میں ہے
ہُوئے ہیں ہوشِ مغاں میری بے خودی پہ نثار
خدا! یہ طرفہ کرامت مرے خمار میں ہے

ضرور اک گیسوئے پُرخم مرے دل کی تمنّا ہے
وہ برہم ہی سہی تاہم مرے دل کی تمنّا ہے
نہ چھیڑ اے سوزِ دل اسکو الگ اے سوزِ دل اس سے
سرشکِ دیدۂ پُرنم مرے دل کی تمنّا ہے

جب امیدوں بھرا دل بھی الٰہی چھن گیا مجھ سے
تو کس کا رنج کس کا غم مرے دل کی تمنّا ہے

کسی کے دورِ ساغر چل مری تقدیر سے مل کر
کہ تیری گردشِ پیہم مرے دل کی تمنّا ہے

مرے ارمانِ دل محرم جو اس کے ہوں تو کیونکر ہوں
کہ اک پردہ نشیں کا غم مرے دل کی تمنّا ہے

خدا وہ داغِ دل کو کیوں مرے پامال کرتے ہیں
وہ کیسا ہی سہی تاہم مرے دل کی تمنّا ہے

حیا کو آنکھ کی لیلیٰ کو محمل کی تمنّا ہے
مرے دل کی تمنّا کو مرے دل کی تمنّا ہے

کسی کے تیر کو کیوں قلبِ بسمل کی تمنّا ہے
یہ کیوں مہمانِ ناخواندہ کو منزل کی تمنّا ہے

الٰہی بھیج دے نقشہ کسی کے روئے تاباں کا
کہ میرے داغِ دل کو ماہِ کامل کی تمنّا ہے

الٰہی بسملوں کو سایۂ دامن ملے کیونکر
ہوا کو بھی اسی دامانِ قاتل کی تمنّا ہے

تمنّا کا دھنی دل تو بتوں میں لٹ گیا یارب
فدا اب کیا ترے بے آرزو دل کی تمنّا ہے

یہ نئی ہوئی رقابت یہ عجیب ماجرا ہے
جسے ڈھونڈتی ہیں آنکھیں اُسے دل بھی ڈھونڈتا ہے

نہ مرا کہیں ٹھکانہ نہ اُسی کا کچھ پتہ ہے
میں تلاشِ ہوش میں ہوں مجھے ہوش ڈھونڈتا ہے

ابھی جائیے نہ دل سے کہ ہے بھیڑ حسرتوں کی
ابھی اور بیٹھ لیجئے ابھی راستہ رُکا ہے

نہ نشان نہ کچھ نشانی نہ حروف ہیں نہ معنی
تری منزلِ فنا میں یہ مقام کونسا ہے

نہ کسی کا نام اس میں نہ انہیں سلام اُس میں
یہ خطِ جبیں الٰہی مرا کس نے لکھ دیا ہے

اسے آپ بھول بیٹھے کسے آپ بھول بیٹھے
اسے کہتے ہیں نیازی وہی آپ کا خدا ہے

ہچکیاں آئیں جھگڑنے نالۂ شبگیر سے
ٹوٹنے والا ہے رشتہ آہ کا تاثیر سے

دل ہے یہ شاید کسی کا دیکھ لے چشمِ تلاش
اک گرہ سی کھل پڑی ہے گیسوئے دلگیر سے

ہے یہ کس بیکس کا ماتم رو رہی ہے زار زار
خاکِ بسمل تک لپٹ کر سایۂ شمشیر سے

وہ مری حیرت ہے یا ان کی خموشی کی ادا
اک مسافر آرہا ہے عالمِ تصویر سے

کھول دی خوش قسمتی نے لو مبارک ہو فسانہ!
جو گرہ کھلنے نہ پائی ناخنِ تدبیر سے

یہ ضد یہ برہمی ان کو مرے حالِ پریشاں سے
کہ بستر تک بھی ہے چیں بر جبیں بیمارِ ہجراں سے

تسلی میں بھی زخمِ رشک پر تازہ نمک چھڑکا
کہ آنسو پونچھتے ہیں وہ مرے دشمن کے داماں سے

تماشا ہم نے دیکھا بھی تو کس کا اپنی وحشت کا
لڑیں آنکھیں تو کس سے روزنِ دیوارِ زنداں سے

اجل سے کیا ڈریں گے مرنے والے ڈر نہیں سکتے
ہے شوقِ وصل آگے دو قدم عمرِ گریزاں سے

ہستی مری پروردۂ آغوشِ فنا ہے
اس آس پہ جیتا ہوں یہی مری بقا ہے

اے سوزِ دل آنسو مرے کیا تجھ سے بجھیں گے
بہتا ہوا دریا بھی کہیں بند ہوا ہے

رگ رگ سے چلی آتی ہے آوازِ خموشی
اے حضرتِ دل سنئے کہ یہ اور صدا ہے

اپنا یہ عقیدہ ہے کہ گلزارِ ارم بھی
جنت ہے جو اس میں ترے کوچہ کی ہوا ہے

ساغر کو خبر کیا ہے ترے بے خبروں کی
وہ کس کا پتہ دے گا جو خود ڈوبا ہوا ہے

کہیں سے گے آئینے سب عیب منہ پر کج ادائی کے
بگڑتے ہیں تو بگڑیں ان سے تیور خود نمائی کے

ندامت نے خدا رکھے میری تقدیر چمکا دی
مرے عصیاں ستارے ہیں جبینِ پارسائی کے

نہیں شوقِ دل آزاری اسے لپکا محبت کا
تمہاری دھن میں دل ہو تم دھنی ہو دلربائی کے

مبارک طائرِ روحِ مقیّد لے مبارک ہو
کہ سانسوں پہ پیام آنے لگے تیری رہائی کے

خدا رحمت کا سایہ جب سے میخانہ پہ دیکھا ہے
خوشامد کرتے ہیں رندوں کی دعوے پارسائی کے

اچھی صورت میں خدا رکھے کسی کا تیر ہے
دل کا دل ہے اور یہ تصویر کی تصویر ہے

دید کے قابل جلوس جذبۂ نخچیر ہے
پیچھے پیچھے ہیں ادائیں آگے آگے تیر ہے

جانتا ہے زخمِ دل پہچانتا ہے زخمِ دل
جتنے تیر انداز ہو جتنا تمہارا تیر ہے

اپنی میری شکل کا کر لیجیے آ کر فیصلہ
ایک سی تصویر ہے یا ایک ہی تصویر ہے

بھولی بھالی ان کی صورت بھولی بھالی ہر ادا
سیدھا سادھا ناوک افگن سیدھا سادھا تیر ہے

قید گیسو سے بھی پروانے نہ آخر بچ سکے
شمعِ کُشتہ کا دھواں ان کے لیئے زنجیر ہے

جو اشاروں پہ چلے آنکھوں کے خنجر ہے وہی
چٹکیوں میں جو تری اُڑ تا رہے وہ تیر ہے

ہاتھ سے جو ان کے چل جائے وہ ہے تیغِ اجل
ان کے منہ سے جو نکل جائے وہی تکبیر ہے

میری آنکھیں اور یہ جلوے تیری قدرت کے نثار
کیا مری خواب تمنا کی یہی تعبیر ہے

توبہ توبہ زخم تک ہنستے ہیں اوچھے وار پر
کیسے تیر انداز ہو کیسا تمہارا تیر ہے

مست ہیں کیا کیا معاصی بوئے رحمت سے فدا
زینتِ جنت مرا گلدستۂ تقصیر ہے

شوق نظارہ بھی مست عرفان ہو جائے
تو جو پردے سے حقیقت کے نمایاں ہو جائے

چشم دل روئے تو پیمانۂ طوفان ہو جائے
ہنس پڑیں آپ تو دنیا چمنستان ہو جائے

تیز کچھ اور مری آتشِ پنہاں ہو جائے
کچھ کرم اس پہ بھی اے جنبشِ داماں ہو جائے

اے صبا دامنِ قاتل کو نہ چھو اس کو نہ چھیڑ
دیکھ شیرازۂ بسمل نہ پریشاں ہو جائے

پرزے تیرے بھی اڑیں دامنِ امید عدو
تو بھی اللہ کرے میرا گریباں ہو جائے

ہر پری رُو اسے آنکھوں سے لگالے بڑھ کر
میرا ہر نقشِ جبیں نقشِ سُلیماں ہو جائے

اہلِ محشر تری رحمت کی بہاریں لوٹیں
دامنِ حشر اگر دامنِ عصیاں ہو جائے

التجا یہ ہو کہ مشکل ہی کوئی پیش نہ آئے
کیوں تمنّا ہو کہ مشکل کوئی آساں ہو جائے

جو نہ ان کا ہو وہ کعبے سے نکالا جائے
بت جسے اپنا بنالیں وہ مسلماں ہو جائے

حسرتوں کو مری بن جائے وہ گلزارِ خلیل
آتشِ سینۂ سوزاں جو فروزاں ہو جائے

زخمِ پنہاں یہ مرے تہمتِ سودا کیا خوب
یہ بھی کیا باغِ عدو ہے کہ بیاباں ہو جائے

اہلِ دل، اہلِ بصیرت اسے سن کر جھومیں
تیرا ہر شعر شدا! بادۂ عرفاں ہو جائے

وہاں تیوری پہ بل آیا یہاں جانِ حزیں نکلی
تمنائے شہادت ان سے بڑھ کر نازنیں نکلی
الٰہی کس سے سمجھوں رازِ الفاظ و معانی کے
الٰہی کس قلم سے میری تحریرِ جبیں نکلی
نہیں ملتی وہ راہیں رہروانِ دشتِ غربت کو
کدھر سے چل دیا دامن کدھر سے آستیں نکلی
سیہ کاروں کے سر پر ابرِ رحمت چھا گیا کیوں کر
شفاعت کو الٰہی کس کی زلفِ عنبریں نکلی
بڑی نعمت ہے ضبطِ سوزِ الفت کو خدا رکھے
رہا کیا قلبِ سوزاں میں جو آہِ آتشیں نکلی
جہاں لطف و عنایت کے خزانے بخشے جاتے ہیں
اسی خرمن کی تقدیرِ قضا ابھی خوشہ چیں نکلی

کے دن کی یہ بہاریں کے دن کی یہ ہوا ہے
اے دیدۂ تغافل کیا خواب دیکھتا ہے
ساقی سے مل کے ان کے لب تک پہنچ گیا ہے
یہ ہو نہ ہو ہمارا پیمانۂ وفا ہے
کیوں مارے ڈالتا ہے خوفِ شکستِ توبہ
توبہ بھی ہم نے چھوڑی توبہ بھی اب خطا ہے
کیا اس نے سوتے سوتے شبنم کو روتے دیکھا
نرگس کی آنکھ سے کیوں آنسو ٹپک رہا ہے

بے خوف پی رہا ہوں پیرِ مغاں کی دھن میں
ذوقِ گناہ میرا کس درجہ پارسا ہے
ملتھے پہ برہمن کے توحید کی ہے سُرخی
اللہ کے الف کا قشقا کھنچا ہُوا ہے
کیا چاندنی سحر کی افسوس ہے سحر پر
اتری ہُوئی گلوں کی یہ ملگجی قبا ہے
یہ لیجیے ہو گئیں طے سب منزلیں فنا کی
جس شکل کو بھی دیکھیں وہ صُورتِ فدا ہے

کیا حواس کو گم جلوۂ نہاں کے لیے
نشان کھو گیا میرا تیرے نشاں کے لیے
شمار بن گئیں آخر خضر کے سانسوں کی
دعائیں تھیں جو مری عمرِ جاوداں کے لیے
الٰہی کر مری روشن دلی کی عمر دراز
کہ ایک شمع ہے یہ بزمِ جاوداں کے لیے
گلے میں چبھتی ہے ہر سانس آنے جانے میں
یہ بوئے سوز نے کانٹے مری زباں کے لیے
ہمارے ضعف پہ نالوں کو جب نہ رحم آیا
گلے نے بیٹھ کے آخر قدم فغاں کے لیے
فدا عروسِ مضامیں کی رونمائی میں
ملی ادائے فصاحت تری زباں کے لیے

تجھے کیا کیا نہ کچھ ہم اے مزاجِ یار سمجھے تھے
بگڑی سرکار سنتے تھے بڑی سرکار سمجھے تھے

نہاں تھی ذرّہ ذرّہ میں نمودِ جلوہ آرائی
ہر اک ذرہ کو ہم آئینۂ اظہار سمجھے تھے

رگِ گل کو خطِ تقدیرِ بلبل جانتے تھے ہم
گلوں کو دلنوازِ عندلیبِ زار سمجھے تھے

انہیں کی اچھی گذری کچھ انہیں کی کٹ گئی اچھی
جو چلتی سانس کو چلتی ہوئی تلوار سمجھے تھے

سہارا دے رہے تھے جھومتے پھولوں کو جھک جھک کر
نسیمِ صبح کے جھونکے انہیں مے خوار سمجھے تھے

جہاں بیٹھے تھے ہم بیٹھے تھے اُن کے آستانے پر
جہاں سوئے تھے ان کا سایۂ دیوار سمجھے تھے

الٰہی نزہتِ گل اس پہ کیا احسان کرتی ہے
کہ شبنم موتیوں سے اس کا مُنہ ہر صبح بھرتی ہے

پریشانوں سے ان کی زلف کی اچھی گذرتی ہے
کہ شب بھر وہ بگڑتی رہتی ہے دن بھر سنورتی ہے

غریب اشکوں کی کشتی ہے تو بس اک دیدۂ گریاں
یہی ڈوبے ہوؤں کا اپنے بیڑا پار کرتی ہے

دعا دے اے شمیم گل نسیم صبح کے دم کو
کہ یہ غنچوں کے قیدی صبح کو آزاد کرتی ہے

جب آنکھوں میں نہیں آتی فدا اس شوخ کی صورت
تو کس زینے سے آخر یہ مرے دل میں اترتی ہے

نعت

کملی سے دکھا کے جھلک اپنی انداز سے کملی والے نے
مشتاق دلوں کو چھین لیا کس ناز سے کملی والے نے

ہر چھوٹی بڑی نے میں بھر کر تصدیق رسالت کا نغمہ
توحید کی لے سنوا چھوڑی ہر ساز سے کملی والے نے

کیا خوب بلالؓ کو ہوش دیا گیسو کی ہوائیں دے دے کر
کیا کام کیا کیا کام لیا دمساز سے کملی والے نے

عالم میں ذرہ ذرہ سے اللہ احد کا شور اٹھا
توحید کا نغمہ سنایا جب آواز سے کملی والے نے

بن بن کے فدا کیا کیا چہکا گلشن میں جناب حافظ کے
جو ہند میں بھیجا تھا بلبل شیراز سے کملی والے نے

جب ترے جلوے کا ہر ذرہ نظارہ کوش ہے
تیرا وعدہ کیوں حجاب حشر میں روپوش ہے

پینے والوں کی طرح کیوں جھومتی ہے رات دن
شاخ گل بھی آپ کے گلشن میں کیا مے نوش ہے

رہتے آنکھوں میں تو دنیا جانتی پہچانتی
دل کو یوں بھیدی بنایا ہے کہ وہ خاموش ہے

پھول نے کیوں کپڑے پھاڑے آخر اے ساز خفی
کیا یہ تیرا نغمہ سننے کو ہمہ تن گوش ہے

ایک پیراہن آتارا دوسرا پہنا فند!
چشمِ بد دور آپ کی ہستی بھی کیا خوش پوش ہے

تمہارا ہم تم آئینوں کا جلوہ دیکھنے والے
بتاؤ کون ہیں دونوں میں اچھا دیکھنے والے

چلے تھے ڈھونڈنے خار تمنا کی خلش دل میں
لیے بیٹھے ہیں خود تلوں کو کانٹا دیکھنے والے

مٹے ہیں دیدۂ مشتاق مطفِ پائمالی پر
بچھے ہیں راستے میں ان کا رستا دیکھنے والے

خیال خود نمائی شوخ چشمی حسن آرائی
ہوئے ہیں جمع آئینے میں کیا کیا دیکھنے والے

تو کیا ہم سے نہیں آتا ہے یوں بے ہوش ہو جانا
تو کیا موسٰے ہی تھے جلوہ تمہارا دیکھنے والے

بتوں کی دید میں ہم داخلِ ثواب رہے
کہ دیکھتے ہوئے اللہ کی کتاب رہے

خدنگِ ناز نے چھیڑا تو ہنس کے ٹال دیا
مذاق میں بھی مرے زخم لاجواب رہے

نئے وصال کا پہلو ملا مقدّر کو
مرے نصیب تیرے ساتھ مستِ خواب رہے

مئے کرم کے نشے نے کیا ہے متوالا
مرے ثواب بھی آلودۂ شراب رہے

سمجھ گئے یہ معمّا تری خموشی کا
کہ غنچے گلشنِ عالم میں لاجواب رہے

جنابِ شیخ یہ کیا ہے کہ آج جنّت میں
گنہگار تو پہنچے مگر جناب رہے

سوالِ وصل پہ دل نے سمجھ لیا کیا کیا
کسی کی ایک خموشی میں سو جواب رہے

جو سوئے تو مری قسمت بنے ترے فتنے
جو جاگ اٹھے تو زمانے کے انقلاب رہے

الٰہی ان کو ملا کیا انہیں تو کچھ نہ ملا
فدا بتوں میں خدا واسطے خراب رہے

روئے صنم کا آئینہ دل کو بنائیں گے
کعبہ کو ہم بتوں کا تماشا دکھائیں گے

لا چشمۂ آرزو میں انہیں لے نگاہِ شوق
ہم اُن کو پتلیوں کا تماشہ دکھائیں گے

یاد آگیا کسی کا تبسم اگر انہیں
غنچے بھی چٹکیوں میں سحر کو اڑائیں گے

جب وسوسہ دُوئی کا مٹے گا تو دیکھنا
صورت پہ آپ وہ مری قربان جائیں گے

مجھے مقام سے کوئی اتنا نہیں ہے
مری لغزشوں کا سہارا نہیں ہے

وہ اک تم کہ دنیا کی دنیا تمہاری
یہ اِک ہم کہ دل بھی ہمارا نہیں ہے

اسی میں یہ سب سے نرالی ادا ہے
کہ سب کا ہے وہ اور کسی کا نہیں ہے

یہ کس کام کا ہے نہ ان کا نہ میرا
اگر دِل میں کوئی تمنا نہیں ہے

ہے زلفوں کا سایہ تو اللہ حافظ
ترا شامِ فُرقت سویرا نہیں ہے

اگر ناز ہے تم کو اپنی اَدا پر
مرا دِل بھی کچھ ایسا ویسا نہیں ہے

کبھی ہے رخ کی کبھی گیسوؤں کی بات بڑی
کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

کسی کی شان ہے کچھ اور نہ کوئی بات بڑی
صفات جس کی بڑی ہیں اسی کی ذات بڑی

چھچھوری باتوں پہ دشمن کے روٹھنا اے دل
ترے مزاج میں ہے یار واہیات بڑی

اٹھا دیا انہیں آخر انہیں کی محفل سے
یہاں تو کر گئے وہ دشمنوں سے گھات بڑی

نہ پوچھتا تھا کبھی بات تک کوئی جن کی
بڑے بڑوں سے وہ کرتے ہیں تن کے بات بڑی

وہی زمانہ پھر آیا خدا نہ گھبراؤ
کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

دل میں حسرت ہی رہے پھر تو نہ ارماں کوئی
خود جو بن جائے انیس غمِ ہجراں کوئی

آنکھ ملتے ہی ہوا سر بگریباں کوئی
ٹوٹنے والا ہے ہر عہد کا پیماں کوئی

رحمتِ حق نہ بھرے پھول تو میرا ذمّہ
آکے پھیلائے بھی تو دامنِ عصیاں کوئی

نامہ بر دوڑ کے زلفوں کی بلائیں لینا
تجھ سے پوچھے جو مرا حال پریشاں کوئی

بیخودی کا جو یہ صدقہ ہے تو رخصت اے ہوش
اور ڈالے رہے منہ پر مرے داماں کوئی

اے غمِ دل شکنی اس کی بلائیں لینا
ان کا ٹوٹا ہوا مل جائے جو پیماں کوئی

دل کو تیروں سے اڑاتے ہو یہ کیا کرتے ہو
اپنے مسکن پہ لگاتا نہیں پیکاں کوئی

تم نے دیکھے ہی نہیں قلبِ فدا کے جلوے
لئے پھرتا ہے چراغِ تہِ داماں کوئی

عید کی آج خبر آئی ہے میخانے سے
کہ گلے ملتے ہیں شیشے مرے پیمانے سے

چل گئی کیا کسی بدمست کی پیمانے سے
لغزشیں دوڑی چلی آتی ہیں میخانے سے

چھیڑ گئی بادِ صبا کی کسی مستانے سے
بے پروں کاگ اڑے جاتے ہیں میخانے سے

بے کسی تجھ کو مرے کوسنے والوں کی قسم
سچ بتا دے کہ وہ خوش ہیں مرے مر جانے سے

پیرِ میخانہ کا مے خانے سے اٹھے گا جلوس
آج چھڑکاؤ کیا جاتا ہے پیمانے سے

زلف کو اے خم تقدیر معافی دیدے
ہاتھ اب کانوں پہ رکھتی ہے یہ بل کھانے سے

دیکھئے جھکتا ہے کعبہ کا پھریرا کہ نہیں
آپ آواز تو دیجئے اُسے بت خانے سے

اور سب چھوڑ گئے ساتھ جنوں میں اسکا
چشم آہو نہیں پھرتی ترے دیوانے سے

نکلی چالاک کی پیماں شکنی بھی چالاک
ساز ہے اس کا تو ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

شکل کہتی ہے فدا سے متحیّر ہوکر
آپ کیا ہو گئے تصویر بدل جانے سے

حسن پنہاں چھوڑ کر حسن تباں دیکھا کیے
ہم کہاں کے دیکھنے والے کہاں دیکھا کیے

بند کیں آنکھیں تو حسن بے نشاں آیا نظر
کھل گئیں آنکھیں ہم حیرانیاں دیکھا کیے

کر دیا رشک دوئی نے بے مزہ احساس وصل
ہم نگاہِ شوق کی گستاخیاں دیکھا کیے

اُڑ کے میری خاک خاک کوئے جاناں سے ملی
ان زمینوں کے تماشے آسماں دیکھا کیے

دیکھ پایا کچھ نہ انجامِ محبت کو فدا
تیر زخموں کی مرے گہرائیاں دیکھا کیے

پردے سے نکل آئی یہ کس کی جبیں سائی
یہ نقش قدم کس کے سجدوں کے تماشائی

قسامِ محبت نے بانٹی میری رُسوائی
میں ان کا تماشا ہُوں وہ میرے تماشائی

آہیں بھی ہوئیں رخصت نالوں نے بھی گھر چھوڑا
بھاگے نہ کہیں تنہا گھبرا کے شکیبائی

میں کیا کہوں کس کس کو آئینہ بنا ڈالا
اس پر ہے خدا رکھے یہ دعوٰے یکتائی

عشاق کے سینوں میں دل ہے نہ کلیجہ ہے
اللہ یہ اب کیوں ہے پلکوں کی صف آرائی

جان کس کشتۂ الفت کی اس انداز میں ہے
کس لیے آج تبسم لب اعجاز میں ہے

بلبل نغمہ سرا پھُول نیچے جاتے ہیں
کس دبے پاؤں کی آہٹ تری آواز میں ہے

شکوۂ خانہ براندازیٔ غفلت بیکار
سوز کی ریشہ دوانی بھی اسی ساز میں ہے

صاف ناقوس سے کعبہ کی اذاں سنتا ہُوں
وہ مرا بولنے والا ہر اک آواز میں ہے

جیتے جی جان سے جانے میں ہے مشتاق فدا!
ایک یہ خاص دلیری ترے جاں باز میں ہے

دل کو اُس زلفِ خطاپوش کا سودا ہو جائے
اک سیہ کار کو سیرِ شبِ اسرا ہو جائے

پھول بن جائیں مری خاک کے ذرّے یارب
میری جنت مجھے صحرائے مدینہ ہو جائے

خالی گودوں مرے برباد بگولے نہ پھریں
میرا دامانِ سخا دامنِ صحرا ہو جائے

بے خودوں میں کبھی کوئی سونگھنے والا نہ ملے
بُوئے گل بھی سرِ گل کے لیے سودا ہو جائے

سوزِ الفت سے فدا اتنا بھرا بیٹھا ہوں
موجِ دریا کو بھی چھیڑوں تو شرارا ہو جائے

بتاؤں کیا اگر پوچھے کوئی نادیدہ منزل سے
یہ کیسا شور ہے پردہ کا اک بے پردہ محمل سے

نئی طرزِ ستم سے اب کے رنگ آرائیاں ہونگی
کہ سینچی جا رہی ہے شاخِ گل خونِ عنادل سے

الٰہی کتنے بیدل ہیں جنہیں یہ بخشے جائیں گے
ہزاروں دل بنائے جا رہے ہیں کیوں مرے دل سے

حباب آنے لگے اب تو قریب جام سے بن کر
تواضع ہو رہی ہے مستِ غم کی دورِ ساحل سے

کوئی اے انقلابِ عشق ایسی شکل پیدا کر
وہ دیکھیں میری آنکھوں سے مجھے چاہیں مرے دل سے

غریب الفاس کا کوئی تو خضرِ راہ بن جاتا
یہ پردیسی مسافر نابلد ہیں اپنی منزل سے

اسی جانب سوالِ وصل کی تمہید پیدا کر
جدھر منہ پھیرے بیٹھے ہیں فدا وہ اپنے سائل سے

اترے جو گلستانِ رسولِ عربی سے
وابستہ ہیں وہ پھول بہارِ قرنی سے

خود ہی تو وہ ہر شے سے اٹھا دیتے ہیں پردہ
ارشاد ہے پھر خود ہی کہ کہنا نہ کسی سے

تھا محملِ لیلےٰ مرا ہر چاکِ گریباں
واقف ہی نہ تھا قیس مری پردہ دری سے

ہر زخمِ نہاں سے مرے کیوں چلتے ہیں ٹانکے
اے سوزِ دروں لاگ ہے کیا بخیہ گری سے

شاید ہو وہی یوسفِ گم گشتہ کی منزل
سنتا ہوں جو اک نغمہ صدائے جرسی سے

سینہ چمنستاں ہے مرا دل کی بدولت
لایا ہوں عجب پھول بہارِ مدنی سے

ہاں ہاں بڑی نعمت ہے فداؔ ان کی امانت
ہشیار رہو راز کی تم پردہ دری سے

جو نقش بوسِ کفِ بوتراب ہوتا ہے
وہ ذرہ ذرہ نہیں، آفتاب ہوتا ہے

کسی کے نقشِ قدم چل ہمیں وہیں سے چل
ہمارا سجدہ جہاں کامیاب ہوتا ہے

جہاں گراتے ہیں وہ بجلیاں تبسم کی
جلوس میں دلِ پُر اضطراب ہوتا ہے

سناتی ہیں کبھی موجیں جو داستانِ حیات
تو روئیداد ہمارا شباب ہوتا ہے

فداؔ جہاں کی پریشانیاں تماشا دیکھ
ابھی ابھی کرم بے حساب ہوتا ہے

دل گیا مایۂ حیات گئی — تم گئے دل کی کائنات گئی
جب سے قیدِ تعینات گئی — ہم سے پابندیِ جہات گئی
طے ہوئی منزلِ حیات و ممات — کائنات آئی کائنات گئی
شام سے دن تو ساتھ چھوڑ گیا — ساتھ کس کے ہماری رات گئی
ہٹ گئی زلف روئے روشن سے — عید آئی شبِ برات گئی
برہمی خیر ہم تو سہہ لیں گے — آپ کی وضعِ التفات گئی
چھا گئے آپ ہر دو عالم پر — اب امیدِ تجلیات گئی

یہ ہلکی سی کراہیں ہو نہیں سکتیں فغاں میری
الجھتی ہیں مری سانسوں سے ناحق ہچکیاں میری

مبارک میری فریادوں کو سرافرازیاں میری
فضائے قرب میں بس ایک وہ ہیں یا فغاں میری

جنہیں چھینٹے دئے تھے آپ کی موجِ تبسم نے
بسی ہے آج انہیں پھولوں میں شاخِ آشیاں میری

فضا بابِ کرم کی آ رہی ہے پیشوائی کو
بڑی پہونچی ہوئی اللہ والی ہے فغاں میری

پکڑ لے اس کی انگلی ہے کوئی اللہ والوں میں
کہ اک نادیدہ رستے سے سدھاری ہے فغاں میری

بُرا ہو ہچکیوں کا کیا خبر تھی مرنے والوں کو
کہ کانٹوں میں گھسیٹی جائے گی عمرِ رواں میری

پڑا ہے اس پہ سایہ سرفروشانِ محبت کا
قلم ہو کر بھلی پھولی ہے شاخِ آشیاں میری

فدا ہوں بلبلِ ہندوستان کے نغمہ سنجوں میں
سجاتی ہیں مزارِ داغ کو گلریزیاں میری

وہ اشکِ تمنا کا مری نورِ نظر ہے
بہہ جائے تو کوثر چمک اٹھے تو گہر ہے

کیونکر رہے آزاد اسیروں کی تمنا
جلوہ بھی ترا آج گرفتارِ نظر ہے

غنچوں کا تبسم ہے مرے خواب کی تعبیر
ہر گل مری جاگی ہوئی قسمت کی سحر ہے

نبضوں کی مے عشق سے بہکی ہوئی رفتار
اک قافلۂ ہوش کا خاموش سفر ہے

ہے اُن کے تبسم کی دل افروز کرامت
شبنم جو تری بھیگتی راتوں کی سحر ہے

کس شرم سے آنکھ اُٹھتی نہیں ہے سرِ محشر
کس دل کی کمائی تری قدر دیدۂ منظر ہے

کیوں حسنِ نہاں کا دلِ معصوم ہے پردہ
تسلیم اگر رابطۂ شمس و قمر ہے

تلوے ترے نازک ہیں تو یہ کیسی نزاکت
کیوں سانس کے کانٹوں میں تری راہ گذر ہے

آبیٹھے ہیں جب آپ ہی آنکھوں میں فدا کی
فرمائیے اب اُس کی نظر کس کی نظر ہے

کسی پردے والے نے اچھی صدا دی
مرے عشق کی سوتی دنیا جگا دی

ترے قرب نے مجھکو پردے میں رکھا
مرے سانس نے تیری چلمن اٹھا دی

ترے ذکر پہ شاخِ گل جھوم اُٹھی
ترا نام آیا تو گردن جھکا دی

تجھے ذرّے ذرّے نے جی بھر کے دیکھا
ہمیں آتے دیکھا تو چلمن گرا دی
وہ مٹھی میں دل لے کے فرما رہے ہیں
اسے کہتے ہیں دیکھئے دل تھما دی

کتنی معصوم پھبن ہے ترے دیوانوں کی
صبح کھاتی ہے قسم ان کے گریبانوں کی

کی نہ کچھ زخموں نے خاطر ترے پیکانوں کی
سخت توہین ہوئی گھر کے ہی مہمانوں کی

جوشِ گریہ تجھے کن آنکھوں سے دیکھے کا جنوں
خاک بھی اُڑنے نہ دی تو نے بیابانوں کی

آج میخانے میں دم توڑ رہی ہے توبہ
سُن کے آوازِ شکستہ ترے پیمانوں کی

تیری تصویر کے سانچے میں ڈھلا بیٹھا ہوں
مجھ کو کیا ڈھونڈیں گی آنکھیں ترے دربانوں کی

لے ہی بیٹھے تھے انہیں جوشِ جنوں کے دھکے
بات رکھ لی تری زلفوں نے پریشانوں کی

لے لیا گود میں اک دستِ کرم نے آکر
گردن اٹھنے بھی نہ پائی تھی پشیمانوں کی

حسرت و یاس و الم سب ہیں تمنّا کے غلام
آج آباد ہے دنیا ترے احسانوں کی

چھالے تلووں میں مرے پھونک کے رکھتے ہیں قدم
گرم محفل ہے ترے سوختہ ساماناں کی

بھیس میں تیر ادا کے نگہِ ناز بھی آئے
نام اِس کا بھی ہے فہرست میں مہمانوں کی

سُرمۂ طور بنی آج بگولوں کے لیے
خاک جھونکی ہوئی آنکھوں میں بیابانوں کی

حسرتِ دید پہ الزام حضوری کیوں ہے
خیرت پوچھنے آیا ہوں نگہبانوں کی

وہ تو سنتے ہی نہیں کون چھڑائے یارب
بے گناہی کو مری قید سے بہتانوں کی

شاعری کا مری مسکن ہے فصاحت آباد
اے فدا شان ہوں اردو کے زباں دانوں کی

ہر شاخِ گل چمن کی ہے فرحت نشاں مجھے
پھولوں میں تولتا ہے مرا آشیاں مجھے

لے چل اسی فضا میں خروشِ فغاں مجھے
کرتا ہے یاد پھر جرسِ کارواں مجھے

میں مٹ کے نیستی کی سمجھ میں نہ آسکا
ہستی بنا گئی ہے عجب چیستاں مجھے

احساسِ قرب بھی نہ رہا کس کی بے خودی
میں ہوں کہاں؟ پکارتے ہو کہاں مجھے

بن کر سرور و لطف رہوں چشم ناز میں
اتنا لطیف کر نگۂ ناتواں سے مجھے

اللہ کس کے جذب تغافل میں کھو گیا
یاد آتے آتے حاشیۂ داستاں مجھے

باب قبول پر کہیں رسوائیاں نہ ہوں
خاموش لے چلا ہے فریب فغاں مجھے

آوارہ کر رہا ہے فریب تعینات
ڈھونڈیں گی اب کہاں مری معصومیاں مجھے

نغمے جھکاتے ہیں مجھے ہر شاخ گل کے ساتھ
بلبل سنا رہی ہے چمن کی اذاں مجھے

سنکر سحر سے شبنم و گل کی کہانیاں
روتی ہے زار زار مری داستاں مجھے

ہستی لرز رہی ہے کہ رسوا نہ ہو فنا
مٹتے نہ دیکھ لے کہیں میرا نشاں مجھے

جو آنکھوں کو مری ترسا رہا ہے
وہی دل میں اُترتا جا رہا ہے

دلِ بسمل کسی تیغ جفا سے
شہادت کے مراتب پا رہا ہے

لبِ نازک کو جنبش ہو رہی ہے
فضا میں رنگ بکھرا جا رہا ہے

ہُوا ہے کون سرگرم تبسّم
کہ پھولوں کو پسینہ آ رہا ہے

مری چھوٹی ہُوئی نبضوں سے پوچھو
کہ اُن کے ہاتھ سے کیا جا رہا ہے

نہاں ہے جس کے ہر قطرہ میں دریا
وہی بادل برستا آ رہا ہے

بڑی کوشش سے اپنے نقشِ پا کو
مرا سجدہ بنایا جا رہا ہے

فنا ! سُن ساز تربت کی صدائیں
دلِ مرحوم کا عرس آ رہا ہے

جھک کر ستارے رُوئے قمر دیکھتے رہے
گردوں کی رات اپنی سحر دیکھتے رہے

چلمن تک اُن کے جانے کی ہمت نہیں پڑی
جھونکے صبا کے دُور سے در دیکھتے رہے

اُف نقشِ پا کی سنگ دلی کوئے یار میں
سجدوں کے میرے خاک بسر دیکھتے رہے

بزمِ عدو میں لطف رہا شوقِ دید کا
ہم ان کی وہ ہماری نظر دیکھتے رہے

کرتے بھی کیا جناب فنا ! قیدیٔ حیات
وقتِ رواں کے زیر و زبر دیکھتے رہے

خیال

اُسے بھی عشاق دھوک لیتے جو تن سے جانِ حزیں نکلتی
مگر یہ مژگاں کی پھانس دل سے نہیں نکلتی نہیں نکلتی

خبر جو کر دیتی وحشتِ دل مجھے کبھی آمدِ جنوں کی
نہ چلتا دامن تو پیشوائی کو خود مری آستیں نکلتی

ہمیں کو دھوکا ہوا کہ ہم نے جگر کو دل چھوڑ کر نہ ڈھونڈا
وگرنہ نوکِ سنانِ ظالم ضرور ملتی کہیں نکلتی

وہ چاہتے تو ضرور مری امیدِ قلبِ حزیں نکلتی

جو ہجر ہی پر مٹے ہوئے ہیں تو ہجر کا پھر عذاب کیسا
سوال ہی جب نہ منہ سے نکلے تو انتظارِ جواب کیسا

وہ چشمِ مخمور ہے سلامت تو کیوں خوشامد ہو ساقیوں کی
جو بے پیے بھی یہ بے خودی ہے تو ہم کو لطفِ شراب کیسا

جو چاہتی اس نگہ کی شوخی تو چشمِ آہوئے چیں نکلتی

اُسے پریشانیوں پہ اپنی جو ایک ساعت قرار ہوتا
تو واقعی قلبِ مضطرب سا نہ دوسرا غمگسار ہوتا

ہمارے داغوں کو دل میں آ کر اگر کبھی پائمال کرتے
تو سیر کو آپ کی بدولت یہ اک نیا لالہ زار ہوتا

ہزار دشوار ہوتی حسرت تو وہ بھی اے ہمنشیں نکلتی

لگی جو نامہ پہ مہر میری تو قلبِ بسمل کا داغ سمجھے
جو زخمِ دل روندنے کو آئے تو اس کو وہ پائیں باغ سمجھے

خیالِ گیسوئے عنبریں میں کیا یہ دلوا نہ بے خودی نے
کہ داغِ ہجراں کو اپنے ارماں اندھیرے گھر کا چراغ سمجھے
کسی کے نقشِ قدم سے مل کر امیدِ نقشِ جبیں نکلتی

فدا رہو قلب قدرداں میں ہمیشہ شانِ اُمید بن کر
مٹا بھی دو پردۂ دوئی کو بہم پہنچ رہو شوقِ دید بن کر
شعارِ اہلِ طلب یہی ہے اسی کو کہتے ہیں پردہ داری
رموزِ کثرت کے پہلوؤں میں چھپے رہو تم وحید بن کر
کچھ اور آتے خیالِ جدت نئی جو کوئی زمیں نکلتی

شجرۂ نسب حضرت سیّد عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی

سیّد عبدالوحید[1] فدا ابن سیّد حیات اللہ[2] (دوم) بن سیّد واحد[3] علی بن سیّد قدرت اللہ[4]
بن سیّد عزت اللہ[5] بن سیّد حیات اللہ[6] (اوّل) بن سیّد فاضل[7] بن سیّد اعظم علی[8]
بن سیّد لاڈو[9] (دوم) بن سیّد فتح اللہ[10] بن سیّد قطب الدین[11] بن سیّد لاڈو[12] (اوّل)
بن سیّد امین الدین[13] بن سیّد حسن[14] بن سیّد عمر[15] بن سیّد احمد واسطی[16] بن سیّد علاؤالدین[17]
بن سیّد شمس الدین[18] بن سیّد تاج الدین[19] بن سیّد حسین[20] (سیّد فریدالدین) بن سیّد ادریس[21] (ادیس)
بن سیّد فرید الدین[22] (زید) بن سیّد علاؤالدین[23] بن سیّد معز الدین[24] بن سیّد ابوالفرح[25] ثانی
بن سیّد ابوالفراس[26] (سرہند) بن سیّد ابوالفرح[27] واسطی بن سیّد داؤد[28] بن سیّد حسین[29] واسطی
بن سیّد یحییٰ[30] بزرگ بن سیّد زید[31] بن سیّد عمر[32] بزرگ بن سیّد زید[33] بزرگ بن سیّد علی عراقی[34]
بن سیّد حسین[35] بن سیّد علی[36] بزرگ بن سیّد محمد[37] بن سیّد عیسیٰ[38] بن سیّد زید الشہید[39] بن سیّد علی اوسط[40] زین العابدین
بن سیّد امام حسین[41] (شہید کربلا) بن سیّد علی کرم اللہ[42] وجہہ الکریم۔

مُرتب: سیّد محبوب حسن واسطی بن سیّد شبیر حسن نیازی بن سیّد عبدالوحید فدا